فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوارِ ربانی	قرآن کا معجزہ	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	7
قولِ نبیؐ	وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا	محمود غزنوی	12
خاص مضمون	فگاروں کا سفر	مشکور حسین یاد	17
نوائے شوق	برکتوں والی رات	شمیم فاطمہ	22
	دھرتی کی اداسی	شمیم فاطمہ	22
	پیاری دوست کے لئے	عذرا مریم خان	23
حقیقت وافسانہ	یہی تو جنت کا راستہ ہے	قانتہ رابعہ	24
	بے خوف	ام ایمان	30
	پلّو میں گرہ	حفصہ افضال	36
	ملال	فرحی نعیم	39
ملاقات	بیگم خورشید نیازی سے ایک ملاقات	آسیہ راشد	41
طویل کہانی	پہلا پاکستانی	بشریٰ تسنیم	45
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	54
سیروسیاحت	اجنبی مسافر	آمنہ راحت	58
سفرِ سعادت	درِ محبوب پر	شمشاد احتر	62
انشائیہ	ہوئے ڈر کے ہم جو رُسوا	شمیم فاطمہ	64
نمایاں خواتین کا تذکرہ	ملکہ خیزران	آسیہ راشد	66
نہاں خانۂ دل	انچاس برس پہلے	لمعت النور	68
	اے میرے مالک!	ڈاکٹر رخسانہ جبیں	71
منتخب کالم	مُرسی کے بھیانک جرائم	ڈاکٹر عامر لیاقت حسین	73
گوشۂ تسنیم	رب سے ملاقات	بشریٰ تسنیم	75
بتول میگزین	حفصہ افضال، عصمت اسامہ		78

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! امید ہے روزے بخیریت گزر رہے ہوں گے اوران صبر آزما اوقات میں اکثر یہ فرمانِ خدا یاد آتا ہوگا کہ ''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔'' اب تو یہ مہمان گنتی کے چند روز ہے پھر اگلے سال یا قسمت یا نصیب!! طاق راتوں اور عید کے لمحات میں وطنِ عزیز کی سلامتی کی دعائیں ضرور اپنی دعاؤں میں شامل رکھیں کہ یہ مبارک گھڑیاں پاکستان کی پیدائش کی گھڑیاں بھی ہیں۔

ستیش ورما کا انکشاف اس ماہ کی سب سے بڑی خبر ہے۔ 2008ء میں ہونے والے ممبئی حملوں پر بھارت تو ایک طرف، خود پاکستان میں بیٹھے ہوئے بھارت کے تنخواہ دار سیاستدان، صحافی اور دانشور یہ الزام اپنے سر لینے اور شرمندہ ہونے کے لئے آگے آگے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بھارت پاکستان کی ساکھ خراب کرنے، پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچانے اور عالمی طاقتوں کے اشاروں پر پاکستان کو دباؤ میں رکھنے کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس کا ماضی سراسر پاکستان دشمنی سے عبارت ہے اور اس سے خیر کی کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ بغیر کسی ثبوت کے ایک دہشت گرد کا تعلق پنجاب کے گاؤں سے جوڑا گیا، وہاں کے ایک بے ضمیر شخص کو خرید کر پوری کہانی گھڑی گئی اور پھر اس من گھڑت کہانی کو بھارتی اور پاکستانی میڈیا پر پیش کیا گیا، آج خود ان کے افسر نے اعتراف کرلیا ہے کہ یہ حملے بھارتی حکومت نے کروائے تھے تاکہ پاکستان پر دباؤ بڑھایا جاسکے۔ اس واقعہ نے بھارت کے تو پاکستان کے بارے میں عزائم واضح کردیئے ہیں جو امن کی آشا کے پردے میں بغل میں چھریاں تیز کررہا ہے، مگر پاکستان کے مختلف طبقوں میں موجود بھارتی ایجنٹوں کو بھی اچھی طرح بے نقاب کردیا ہے۔

سپریم کورٹ میں صحافیوں کو ملنے والے فنڈز کے کیس کی سماعت کے دوران جنرل پاشا کا بیان بھی گزشتہ روز موضوعِ بحث رہا کہ ہمارے صحافی عورت، شراب اور ڈالر پر بآسانی بک جاتے ہیں۔ میڈیا کے لوگ بڑے ہیرو بن کر سب کا احتساب کرتے ہیں، اپنے اندر موجود کالی بھیڑوں کا احتساب کیوں نہیں کرتے جنہوں نے اس مقدس پیشے کو بدنام کردیا ہے، ہمارا ماضی مولانا ظفر علی خان، آغا شورش کاشمیری، حمید نظامی اور مصطفیٰ صادق جیسے صحافیوں کی روشن مثالوں سے تابناک ہے جنہوں نے ڈٹ کر کلمۂ حق کہا اور کسی جبر یا ترغیب کی پروا نہیں کی۔ صحافت کو ایک مقدس پیشہ سمجھا اور ہر طرح کے حالات میں اس سلسلے میں خود میڈیا میں موجود باضمیر عناصر کو جرأت سے کام لیتے ہوئے آگے آنا چاہیے اور ایسے قوانین بنوانے چاہئیں جن کے تحت معاشرے کا احتساب کرنے والے خود بھی احتساب کے دائرے میں لائے جاسکیں۔

نئی حکومت نے آتے ہی کشکول کو توڑنے کی بجائے جھاڑ پونچھ کر دوبارہ آئی ایم ایف کے آگے پھیلا دیا ہے اور پانچ ارب تیس کروڑ ڈالر کے قرضے منظور کروالیے ہیں۔ انتخابی منشور اور انتخابی جلسوں میں خودانحصاری کے وعدے اور قرضہ نہ لینے کے ارادے ظاہر کرنے والے اقتدار میں آتے ہی کیسے رنگ بدل لیتے ہیں، یہ تماشا نیا ہرگز نہیں ہے۔ افسوس تو ہمارے عوام پر ہے جو آزمائے ہوئے مہروں کی لچھے دار باتوں

کے آگے پھر سادگی دکھاتے ہیں اور ''اس بار ایسا نہیں ہوگا'' کی موہوم امید پر سہانے مستقبل کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ بجلی کے بحران کے خاتمے کے لئے تین سے چار سال کی مدت دے دی گئی ہے یوں حکومت کے پانچ سال آرام سے گزارنے کا بندوبست مکمل ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی سیکیورٹی فورس کے ہاتھوں مسجد اور قرآن پاک کی بے حرمتی اور پھر احتجاج کرنے پر سات مسلمانوں کی شہادت بے حد المناک واقعہ ہے۔ یہ مسلمانوں پر ان کے مقدس شعائر کی بے حرمتی کے ذریعے نفسیاتی تشدد کے اسی سلسلے کی کڑی ہے، جو اہل مغرب نے امریکہ کی سرپرستی میں شروع کر رکھا ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ اصل دہشت گرد کون ہیں جو خود کو تمام اصولوں اور قوانین سے بالا سمجھتے ہیں اور ہنستے بستے پرامن انسانوں کو لمحوں میں لاشوں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جن کے اندر انسانیت نام کی کوئی رمق موجود نہیں اور جو نفرت اور تعصب میں اندھے ہو کر جانوروں سے بدتر ہو چکے ہیں۔ ملالہ کو اقوام متحدہ کے ایوانوں میں کھڑا کر کے طالبان کو برا بھلا کہلوانے سے یہ دنیا کی توجہ اپنے جرائم سے نہیں ہٹا سکتے۔

بنگلہ دیش میں بیالیس برس قبل وطن کو متحد رکھنے، بھارتی جارحیت کا مقابلہ کرنے اور پاکستان کا ساتھ دینے والوں کو پھانسی اور عمر قید کی سزائیں سنائی گئی ہیں۔ 95 برس کے ضعیف پروفیسر غلام اعظم کو 90 برس کی سزائے قید دینا وحشیانہ جنونیت اور جوشِ انتقام میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہی 1971ء میں بنگلہ دیش کی علیحدگی کے موقف کا ساتھ دینے والوں کو پاکستان اور بھارت سے ڈھاکہ بلا کر اعزاز سے نوازا گیا تھا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسینہ واجد پوری طرح بھارت کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے اور خطے میں بھارتی مفادات کو بڑھاوا دینے کے لئے سرگرم ہے۔ اس سے زیادہ شرمناک طرزِ عمل ہماری اپنی حکومت کا ہے جس نے پاکستان کے حامیوں کو سزائیں ملنے پر یہ بے رحم تبصرہ کیا کہ یہ بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ ہے جبکہ یہ تو خالص پاکستان کا معاملہ تھا!! فیض کی روح کو خبر ہو کہ خون کے دھبے تو بیالیس برساتوں کے بعد بھی نہ دھلے بلکہ حسینہ واجد ان دھبوں سے آنے والے موسموں کی بھی صورت گری کر رہی ہے!

مصر میں بالآخر مرسی کی حکومت کو فوج کے ذریعے معزول کروا دیا گیا۔ جمہوریت کو الہامی مذہب کا درجہ دینے والے مغرب کے منہ سے افسوس کا ایک کلمہ دکھانے کو بھی نہ نکلا۔ ایک اور مسلمان ملک میں جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا صرف اس لئے کہ اس جمہوریت نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو اقتدار کے ایوانوں میں پہنچا دیا تھا۔ مصری عوام پھر سڑکوں پر ہیں اور اپنا حق مانگ رہے ہیں۔

کراچی میں ٹارگٹ کلنگ اور ملک کے طول و عرض دہشت گردی کی کارروائیاں حسبِ سابق جاری ہیں۔ اس سلسلے میں وفاقی اور صوبائی حکومت سے سنجیدہ کوششوں کا ہنوز انتظار ہے۔ گزشتہ ماہ کے اداریے میں جسٹس مقبول باقر پر حملے کا تذکرہ ہوا۔ وہ زخمی ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی جان بچالی۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔

خوشگوار عید کی دعا کے ساتھ۔

طالبہ دعا

صائمہ اسما

قرآن کا معجزہ

وہ کتاب جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی کتاب نہیں لائی جاسکتی، جو زبان وادب کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور تعلیم وحکمت کے لحاظ سے بھی

☆ فتح مکہ کی پیشین گوئی

قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں مکہ فتح ہونے کی پیشین گوئی مکی دور میں بھی کی گئی اور پھر ہجرت کے بعد مدنی دور میں بھی۔

سورہ ص جو مکی سورہ ہے اور غالباً مکی دور کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی اس میں کفار مکہ کے بارے میں فرمایا گیا:

''یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے۔'' (ص ۱۱)

یہاں ''اسی جگہ'' کا اشارہ مکہ معظّمہ ہے یعنی جہاں یہ لوگ یہ باتیں بنا رہے ہیں، اسی جگہ ایک دن شکست کھانے والے ہیں اور یہیں وہ وقت آنے والا ہے جب یہ منہ لٹکائے اسی شخص یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہوں گے جسے یہ حقیر سمجھ کر نبی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں یہ پیشین گوئی اس طرح کی گئی ہے۔

''اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔ پس اے نبیؐ ذرا کچھ مدت تک انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ جب وہ ان کے صحن میں اترے گا تو وہ دن ان لوگوں کے لیے بہت برا ہوگا۔ جنھیں متنبہ کیا جا چکا ہے۔'' (۱۷۱ تا ۱۷۹)

یہ نوٹس اس زمانے میں دیا گیا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے آثار دور دور تک کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ہجرت حبشہ کے بعد بمشکل چالیس پچاس صحابہ مکہ میں آپؐ کے ساتھ رہ گئے تھے اور انتہائی بے بسی کے ساتھ کفار کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے لیکن پندرہ سولہ سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد جب سورۃ الفتح نازل ہوئی تو اس میں خیبر کی فتح کی پیشین گوئی کرنے کے بعد فتح مکہ اور دوسری فتوحات کے بارے میں یہ خوشخبری دی گئی:

''اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر ابھی تم قادر نہیں ہوئے اور اللہ نے ان کو (تمھارے لیے) گھیر رکھا ہے۔'' (۲۱)

اغلب یہ ہے کہ یہ اشارہ فتح مکہ کی طرف ہے۔ یہی رائے قتادہ کی ہے اور اسی کو ابن جریر نے ترجیح دی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تو مکہ تمھارے قابو میں نہیں آیا ہے مگر اللہ نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے اور حدیبیہ کی اس فتح کے نتیجے میں وہ بھی تمھارے قبضے میں آ جائے گا۔

سورۃ الممتحنہ جو فتح مکہ سے کچھ مدت پہلے نازل ہوئی اس میں فتح مکہ کی پیشین گوئی ان الفاظ میں کی گئی:

''بعید نہیں کہ اللہ کبھی تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت ڈال دے جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور وہ غفور و رحیم ہے۔''(۷)

اس سورہ کی ابتدائی آیات میں حضرت حاطبؓ کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں انھوں نے مکہ والوں کو نبی کریمؐ کے مکہ پر حملہ کرنے کے ارادے کی اطلاع پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اس سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے بارے میں ہی نازل ہوئی تھی۔ اس فتح کی خاص بات جو کہ اس آیت میں کہی گئی، یہ تھی کہ جنگ کیے بغیر کفار مکہ نبی کریمؐ کے مطیع ہو گئے اور پھر سب کے سب ایمان لے آئے اور اس ناطے مسلمانوں کے بھائی بن گئے اور ان کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔

☆ فتح خیبر کی پیشین گوئی

سن چھ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے مدینہ واپسی کے سفر میں سورۃ الفتح نازل ہوئی اور اس میں خیبر اور یہودیوں کے بہت سے مقبوضات فتح ہونے کی پیشین گوئی ان الفاظ میں کی گئی:

''اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی، ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سا مال غنیمت ان کو عطا کر دیا جسے وہ عنقریب حاصل کریں گے۔ اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔''(۱۸،۱۹)

ان آیات کے نزول کو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ نہ صرف یہودیوں کا سب سے مضبوط مرکز خیبر فتح ہو گیا بلکہ اس کے بعد فدک، وادی القریٰ، تیما اور تبوک کی یہودی بستیاں اسلام کے زیر نگیں آتی چلی گئیں۔ پھر وسط عرب کے وہ تمام قبیلے بھی جو یہود اور قریش مکہ کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے ایک ایک کر کے تابع فرمان ہو گئے۔

☆ بنی نضیر کے یہودیوں سے منافقین کا جھوٹا وعدہ

صفر۴ ہجری میں مدینہ میں آباد یہودی قبیلے بنونضیر کی بستی میں ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک اہم معاملے پر گفت و شنید کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ اگرچہ بظاہر ان سے آپؐ کا پرامن رہنے کا معاہدہ

تھا لیکن وہ در پردہ آپ کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور کفار کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس موقعہ پر یہ سازش کی کہ آپؐ پر چھت سے ایک پتھر گرا کر آپ کو ہلاک کر دیا جائے۔ لیکن اس کی پیشگی خبر اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ کو دے دی اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ اس پر حضورؐ نے ان کو بلا تاخیر یہ الٹی میٹم بھیج دیا کہ تم نے جو غداری کرنی چاہی تھی وہ میرے علم میں آ گئی ہے لہٰذا دس دن کے اندر اندر مدینے سے نکل جاؤ۔ اس کے بعد جو شخص بھی تمھاری بستی میں پایا جائے گا اس کی گردن ماردی جائے گی۔ دوسری طرف مدینے کے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی نے ان کو پیغام بھیجا کہ میں دو ہزار آدمیوں سے تمھاری مدد کروں گا اور بنو قریظہ اور بنی غطفان کے قبیلے بھی تمھاری مدد کو آئیں گے۔ تم ڈٹ جاؤ اور ہرگز اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اس پر بنو نضیر نے جلاوطن ہونے سے انکار کر دیا اور آپؐ کو یہ پیغام پہنچایا کہ ہم یہاں سے ہرگز نہ نکلیں گے، آپ جو چاہیں کر لیں۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحشر میں نبی کریمؐ کو یہ اطلاع دی کہ منافقین نے بنی نضیر کی مدد کا جو وعدہ کیا ہے وہ جھوٹا ہے آپؐ ان کے خلاف کارروائی کریں، کوئی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔

''تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنھوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے۔ یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں، اگر تمھیں نکالا گیا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے اور تمھارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے، اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے، پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔'' (الحشر ۱۱، ۱۲)

اس کے بعد ربیع الاول ۴ ہجری میں نبی کریمؐ نے بنو نضیر کی بستیوں کا محاصرہ کر لیا اور کوئی ان کی مدد کو نہ آیا۔ بالآخر جلاوطنی پر مجبور ہو گئے اور اپنی بستیاں خالی کر دیں۔

☆ سورۃ الضحیٰ کی پیشین گوئی

مستقبل کے بارے میں ایک پیشین گوئی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے سورۃ الضحیٰ میں اس طرح بیان فرمائی:

''اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمھارا رب تمھیں اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔'' (۴، ۵)

یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ مکہ کے ابتدائی دور میں صرف چند مٹھی بھر آدمی آپ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ کی مخالف تھی۔ بظاہر کامیابی کے آثار

کہیں دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ اسلام کی شمع مکہ میں ہی ٹمٹمارہی تھی اور اسے بجھا دینے کے لیے ہر طرف طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ ابتدائی دور کی مشکلات سے آپ پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوگا۔ آپ کی قوت، آپ کی عزت و شوکت، اور آپ کی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ پھر یہ وعدہ صرف دنیا تک ہی محدود نہیں ہے، اس وعدے میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپ کو ملے گا وہ اس مرتبے سے بھی بدرجہا بڑھ کر ہوگا جو دنیا میں آپ کو حاصل ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری امت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی، تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آخرت تمھارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے۔'' (بیہقی)

☆ رفع ذکر کی پیشین گوئی

سورۂ الم نشرح میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ورفعنا لک ذکرک خوشخبری سنائی۔ اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آپ کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو پورے عرب میں کوئی مشرک باقی نہ تھا اور عرب کا گوشہ گوشہ اشھد ان محمد رسول اللہ سے گونج رہا تھا۔ پھر خلافت راشدہ کے دور میں آپ کا نام نامی تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بڑھتا ہی جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں با آواز بلند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضورؐ پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ کا ذکر خیر نہ کیا جا رہا ہو۔ سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین پر کسی نہ کسی جگہ حضور کا ذکر مبارک نہ ہو رہا ہو۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک کھلا ثبوت ہے اور قرآن کی پیشین گوئی کا پورا ہونا قرآن کا عظیم معجزہ ہے۔

حضرت ابوسعید حذریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''جبریلؑ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا، میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح آپ کا رفع ذکر کیا۔ میں نے عرض کی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انھوں نے کہا، اللہ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو اس کے ساتھ تمھارا بھی ذکر کیا جائے گا۔'' (ابن جریر)۔ بعد کی پوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

☆ سورۃ الکوثر کی پیشین گوئی

مکی دور میں سردارانِ قریش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حقارت سے ابتر کہتے تھے۔ ابتر کا مطلب

ایک نامراد اور بے وسیلہ، بے سہارا، جڑ کٹا شخص ہے جو تنہا ہو جائے اور اس شخص کو بھی ابتر کہتے تھے جس کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہو یا ہو کر مر جائے اور اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے اور اس کا نام و نشان مٹ جائے۔ کفار قریش نبی کریمؐ کو ان سبھی معنوں میں ابتر کہتے تھے، خصوصاً جب آپ کے دونوں بیٹے حضرت قاسم اور عبداللہ یکے بعد دیگرے وفات پا گئے اور صرف چار بیٹیاں ہی باقی رہ گئیں تو ایک کافر سردار عاص بن وائل نے کہا کہ آپؐ کی نسل ختم ہوگئی، آپؐ ابتر ہو گئے اور آپؐ کی جڑ کٹ گئی۔ اسی طرح کے الفاظ کفار کے سردار ابوجہل، عقبہ بن ابی مُعیط، اور آپ کے چچا ابولہب نے بھی کہے تھے اور خوشیاں منائی تھیں۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکوثر نازل فرمائی اور اس میں آپؐ کو ان الفاظ میں خوشخبری دی اور پیشین گوئی فرمائی:

''بے شک تمھارا دشمن ہی ابتر (جڑ کٹا) ہے۔''(۳)

یہ دراصل قرآن کی اہم پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت لوگ حضورؐ کو ہی ابتر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے۔ لیکن چند سال ہی گزرے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے اور ۸ ہجری میں جب آپ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انھیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر اندر پورا ملک عرب آپؐ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ کے دشمن بالکل بے بس اور بے یارومددگار ہو کر رہ گئے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی تو کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ان سرداروں کی اولاد ہے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جارہا ہے کروڑوں مسلمانوں کو آپ سے نسبت پر فخر ہے۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضورؐ نہیں بلکہ آپ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔

☆ ابولہب کے بارے میں پیشین گوئی

ابولہب مکہ کے امیر ترین مشرک سرداروں میں سے تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ جب آپؐ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ نے لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے کا کام شروع کیا تو آپ کا سخت دشمن ہو گیا۔ آپ کا قریب ترین ہمسایہ ہونے کے باوجود آپ کو طرح طرح سے اذیتیں دیں۔ اس کی بیوی ام جمیل رات کو آپ کے گھر کے دروازے پر کانٹے دار جھاڑیاں لا کر ڈال دیتی۔ آپؐ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے نکلتے تو یہ آپؐ کے پیچھے جاتا اور آپ کے اوپر آوازے کستا۔ اور لوگوں سے کہتا اس کی بات نہ

سنو یہ جھوٹا ہے۔ نبوت سے پہلے آپؐ کی دو صاحبزادیاں اس کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ جب آپ نے نبوت کا اعلان کیا تو ابولہب نے زبردستی دونوں کو طلاق دلوا دی۔ ایک روز جب آپ نے صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر قریش کے تمام خاندانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو وہاں ابولہب بھی موجود تھا اس نے آپ کی بات سن کر کہا ''ستیاناس جائے تیرا، کیا تو نے اس لیے ہمیں جمع کیا تھا۔'' اس پر سورہ لہب نازل ہوئی اور اس میں فرمایا گیا:

''ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور وہ نامراد ہو گیا۔''(۱)

ہاتھ ٹوٹنے سے مراد جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں بلکہ ہلاک ہونا ہے۔ اس آیت میں ابولہب کی ہلاکت کی پیشین گوئی کی گئی تھی جو بالآخر پوری ہوئی۔

اس سورہ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگ بدر میں کفار مکہ کے اکثر و بیشتر بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ ابولہب اس جنگ میں شریک نہیں تھا لیکن جب شکست کی خبر مکہ پہنچی تو اس کو اتنا رنج ہوا کہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس کی موت بھی نہایت عبرت ناک تھی۔ اس کو ایسی جلد کی بیماری ہوئی کہ مرنے کے بعد تین روز تک کوئی اس کے قریب نہ آیا یہاں تک کہ لاش سڑ گئی اور اس کی بو پھیلنے لگی۔ آخر کار جب اس کے بیٹوں کو لوگوں نے طعنے دینے شروع کئے تو انھوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی ڈال کر ڈھانک دیا۔ اس کی مزید اور مکمل شکست اس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اس دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی دُرّہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکہ کے موقعہ پر اس کے دونوں بیٹے عتبہ اور معتب حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لا کر انھوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔

☆ یہودیوں کے بارے میں پیشین گوئی

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ابتدائی دور میں بڑی فضیلت عطا فرمائی ان میں پے در پے انبیاء بھیجے، ان کو فرعون کی غلامی سے نجات دی۔ من وسلویٰ سے رزق دیا۔ شام و فلسطین جیسی بابرکت زمین پر ان کو بسایا لیکن ان لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے پے در پے نافرمانیاں کیں، انبیاء کو قتل کیا، سبت کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر یہودیت کے نام سے ایک نیا دین ایجاد کر لیا اور اپنے آپ کو مسلم کہلانے کی بجائے حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں میں سے ان کے چوتھے بیٹے یہوداہ کے نام پر یہودی کہلانا پسند کیا۔ قرآن کریم میں بڑی تفصیل کے

ساتھ کئی مقامات پر ان کے جرائم بیان کیے گئے ہیں۔ جب یہ لوگ ان جرائم میں بڑھتے چلے گئے اور بالآخر اپنی دانست میں حضرت عیسیٰؑ کو انھوں نے صلیب دے کر قتل کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی۔ آج سے دو ہزار برس پہلے رومیوں نے ان کا قتل عام کیا اور ان کو شام اور فلسطین کی سرزمین سے مکمل طور پر جلاوطن کر دیا۔ اور یہ لوگ ساری دنیا میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے اور مختلف اقوام کے ظلم کا شکار ہوتے رہے۔ بالآخر دو ہزار سال بعد ۱۹۴۸ء میں اپنے زور پر نہیں بلکہ دنیا کی سپر پاورز کی مدد سے ان کے زیر سایہ رہ کر دوبارہ ان کو فلسطین میں زبردستی داخل کر دیا گیا اور اسرائیل نام کی ایک ریاست مصنوعی طور پر تشکیل دی گئی۔ لیکن اس کا وجود بھی صرف امریکہ اور یورپ کی آشیر باد سے قائم ہے اگر وہ کبھی اس کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیں تو یہ ریاست ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے ہمیں ان الفاظ میں بتائی۔

''یہ (یہودی) جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے، یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، اور ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔'' (آل عمران۔۱۱۲)

☆ قیامت کے قریب پوری ہونے والی پیشین گوئیاں

کچھ ایسی پیشین گوئیاں ہیں جو آئندہ پوری ہوں گی۔ قیامت برپا ہونے سے کچھ پہلے دو چیزیں ظاہر ہوں گی ایک یاجوج ماجوج اور دوسرے **دابۃ الارض** (زمین کا جانور)۔ ان آثار قیامت کی خبر اس طرح دی گئی:

''اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ سکے یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں گے اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں گے اور وعدۂ برحق (قیامت) کے پورے ہونے کا وقت قریب آ لگے گا تو یکا یک ان لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا تھا۔ وہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی، ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے بلکہ ہم خطا کار تھے۔'' (الانبیاء ۹۵ تا ۹۷)

''اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت آن پہنچے گا تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔'' (النمل ۸۲)

(جاری ہے)

☆☆☆

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

☆ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۔

''اس (رحمٰن) نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔''

(الرحمٰن ۳،۴)

بیان سے مراد بولنا اور اپنا مطلب و مدعا بیان کرنا ہے۔ بولنا وہ امتیازی وصف ہے جو انسان کو حیوانات اور دوسری ارضی مخلوقات سے ممیّز کرتا ہے۔ یہ محض قوت گویائی ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے عقل و شعور، فہم و ادراک، تمیز و ارادہ، مشاہدہ اور اخذ نتائج اور دوسری ذہنی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں جن کے بغیر انسان کی قوت ناطقہ کام نہیں کرسکتی، اس لیے بولنا انسان کے ذی شعور اور ذی اختیار مخلوق ہونے کی صریح علامت ہے۔

☆مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ۔

''کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔'' (ق ۱۸)

یعنی ایک طرف تو اللہ تعالیٰ خود براہ راست انسان کی حرکات و سکنات اور اس کے خیالات سے واقف ہے اور دوسری طرف ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہیں جو اس کی ایک ایک بات کو نوٹ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کی زبان سے جونہی کوئی لفظ نکلتا ہے وہ بھلا ہو یا برا فوراً ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ اور یہ ریکارڈ حشر کے روز اللہ رب العزت کی عدالت میں پیش کر دیا جائے گا، اور بعید نہیں کہ اس روز آدمی کو اس کے اپنے کانوں سے اس کی اپنی آواز میں وہ باتیں سنوادی جائیں جو وہ دنیا میں کرتا رہا تھا۔

اوپر کی دو آیتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کو بولنے کی صلاحیت کا عطا ہونا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے (اور اسی لیے یہاں اللہ کی صفت رحمٰن کا ذکر کیا گیا)۔ اور اس کے ساتھ ہی اس صلاحیت کا صحیح استعمال انسان کے لیے ایک ذمہ داری اور آزمائش بھی ہے۔ زبان سے نکلی ہوئی ایک بری بات اس کے اعمال نامے میں گناہ کی صورت میں درج ہوگی اور ایک بھلی بات آخرت کے اجر کا باعث بنے گی۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت کردہ ایک لمبی

حدیث میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بہت سی نصیحتیں کرنے کے بعد) مجھ سے فرمایا کہ ''کیا میں تمھیں اس سارے معاملے کا سب سے اہم جزو نہ بتا دوں؟'' میں نے عرض کیا۔ ''کیوں نہیں یا رسول اللہ''۔ آپؐ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا اور فرمایا: ''اس کو روکے رکھ۔'' میں نے عرض کیا کہ ''اے خدا کے نبیؐ، کیا ہم پکڑے جائیں گے ان باتوں کے باعث جو ہم اس زبان سے کرتے ہیں؟'' آپؐ نے (ازراہ محبت) فرمایا: ''اے معاذ تیری ماں تجھے روئے، یہ لوگوں کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں ہی تو ہیں جو اُنھیں منہ کے بل دوزخ میں ڈال دیں گی۔''

اس ضمن میں قرآن کریم کی درج ذیل دو آیتیں بنیادی حکم کا درجہ رکھتی ہیں:

☆وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔

''اور تم لوگوں سے بھلی بات کہو۔'' (البقرہ۸۳)

☆ وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ ط اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا۔

''اور اے نبیؐ میرے بندوں (یعنی مومن بندوں) سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔'' (بنی اسرائیل۵۳)

ان دونوں آیتوں میں ہر حال میں قولِ حسن (بھلی بات) اور قول احسن (بہترین بات) کہنے کا حکم دیا گیا۔

قولِ حسن کیا ہے؟

قول (بات) میں دو چیزیں شامل ہیں۔ ایک بات کہنے کا انداز اور دوسرے خود وہ بات جو کہی جا رہی ہے، یعنی اس کے معنی و مطالب۔ قولِ حسن میں دونوں کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح:

قولِ حسن وہ ہے کہ بات بھی اچھی کی جائے اور کہنے کا انداز بھی اچھا ہو۔ آواز نرم ہو، دھیمی ہو، بھلی معلوم ہو، موقعہ کی مناسبت سے آہستہ یا بلند ہو، الفاظ خوب صورت ہوں، مافی الضمیر ادا کرنے والے ہوں، دلوں کو خوش کرنے والے ہوں۔ اللہ کو راضی کرنے والے ہوں۔ آنکھیں اور چہرہ اپنائیت کا اظہار کریں، بے اعتنائی اور اکتاہٹ ظاہر نہ ہو۔ ہاتھوں کی حرکات بات کی وضاحت کرنے والی ہوں۔

مخاطب کے لیے خیر خواہی کا اظہار ہو، خلوص اور محبت ہو، مخاطب کی طرف پوری توجہ ہو، اس سے منہ پھیر کر بات نہ کی جائے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (لقمان ۱۸)

عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے خواہ مخاطب سے کتنا ہی اختلاف ہو خوش روئی سے بات کی جائے، لیکن دین کے معاملے میں مداہنت اور حق پوشی سے مکمل اجتناب کیا جائے۔

قرآن کریم نے درج ذیل آیت میں قولِ حسن کی تعریف یوں بیان کی ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔

''اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔'' (حم السجدہ ۳۳)

یعنی ایک صالح باعمل مومن لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے کے لیے جو گفتگو کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ قولِ احسن کی بہترین شکل ہے۔ لوگوں کو نیکیوں کی رغبت دلانا اور برائیوں سے روکنا سب سے بھلی بات ہے۔

یہی بات سورۂ عصر میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے یوں فرمائی:

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

''جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں حق اور سچ بات کہنا، اور اگر کوئی دریافت کرے تو حضورؐ کے کمالات اور اوصاف سچائی سے بیان کرنا بھی قولِ حسن ہے۔

قرآنی اصطلاحیں

قولِ حسن کے تحت ہی قرآن کریم میں درج ذیل تین اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ ☆ قولِ لین ☆ قول معروف ☆ قولِ سدید۔

قولِ لَیِّن:

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے ان دونوں عالی مرتبت پیغمبروں کو نصیحت فرمائی:

فَقُوْلَا لَـــهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّـــهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۔

''تم دونوں اس (فرعون) سے نرمی سے بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔'' (طٰہٰ ۴۴)

قولِ لین خوب صورت، نرم اور شیریں لب ولہجہ کی گفتگو ہے، جس میں اخلاص، بے لوثی، دلسوزی ہو، خوش روئی اور کشادہ دلی ہو۔ یہ پیغمبرانہ اسوہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں فرمایا:

''تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آیا ہے۔ تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے۔ تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ اہل ایمان کے لیے

بڑا شفیق اور رحیم ہے۔'' (التوبہ ۱۲۸)

سورۂ آل عمران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم خوئی، نرم دلی، شیریں کلامی اور نرم گفتاری کو مومنین کے لیے اللہ کی رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

''یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم خو ہو، ورنہ اگر تم کہیں تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔'' (آل عمران ۱۵۹)

قولِ معروف:

معروف کا لفظ قرآن کریم میں ان اچھائیوں کے لیے استعمال ہوا ہے جنھیں سب لوگ عرفِ عام میں اچھا سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں برائیوں کے لیے منکر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات رکھی ہے کہ کچھ کام اچھے ہیں کچھ برے۔ کسی بھی مذہب وملت سے تعلق رکھنے والے انسان سے آپ پوچھیں کہ سچ بولنا کیسا ہے وہ یہی کہے گا کہ یہ ایک اچھی بات ہے۔ اس طرح اگر کسی سے پوچھیں گے کہ جھوٹ بولنا اور چوری کرنا کیسا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ یہ برائیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن نیکیوں کا حکم دیا ہے وہ سب انسان کی فطرت کے مطابق ہیں، اس لیے انھیں معروف کہا گیا۔ شیطان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ انسان کو وقتی فائدے کا لالچ دے کر معروف سے روکے اور منکر کی ترغیب دے۔

اس طرح قولِ معروف کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی بات کہ سننے والا اپنے دل سے یہ گواہی دے کہ یہ بات تو بہت معقول ہے، مبنی بر انصاف ہے، حق ہے، نیکی ہے، شیریں بات ہے، پاکیزہ ہے، واضح ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں، کوئی برائی نہیں، کسی کی حق تلفی نہیں، خیانت نہیں، کوئی جانبداری نہیں، کسی کی بے جا حمایت نہیں۔

ذیل میں قرآن کریم سے قولِ معروف کی تین مثالیں درج کی گئی ہیں جن سے قولِ معروف کے معنی سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ط وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ۔

''ایک میٹھا بول اور ایک ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔'' (البقرہ ۲۶۳)

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔

''مگر دیکھو (ان بیوہ عورتوں سے نکاح کرنے کے لیے) کوئی خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔'' (البقرہ ۲۳۵)

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔

''اور جب (وراثت کی) تقسیم کے موقعہ پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔'' (النساء ۸)

قولِ سدید:

قولِ سدید کا مطلب ہے بالکل ٹھیک، سیدھی اور درست بات جو راست روی پر مبنی ہو۔ قولِ حق ہو اور اس میں جھوٹ کا شائبہ تک نہ ہو۔ سچی تلی بات، سچی بات جس میں حقائق چھپانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ لگی لپٹی بات نہ ہو۔ اس میں منافقت نہ ہو، مداہنت نہ ہو۔ بالکل Straight forward بات۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا ۔ یُّصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ۔

''اے ایمان والو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ٹھیک بات کرو اللہ تمھارے اعمال درست کر دے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔'' (الاحزاب ۷۰،۷۱)

یعنی قولِ سدید تقویٰ کی علامت ہے اور ایمان کی نشانی ہے۔ قولِ سدید سے اعمال کی اصلاح ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ گناہوں سے درگزر کر دیتا ہے۔

حسنِ مجادلہ

دین کی دعوت دینے والوں کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ دانائی اور حکمت سے کام لیں اور اپنی بات بہترین انداز میں لوگوں تک پہنچائیں۔ جن کو دین کی طرف بلایا جا رہا ہے ان کے لیے دل میں ہمدردی ہو، خلوص ہو، بے لوثی ہو اور شدید خواہش ہو کہ اللہ انھیں گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف مائل کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ ط اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَھُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُھۡتَدِیۡنَ ۔

''اے نبیؐ! اپنے رب کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے سے جو بہترین ہو۔ تمھارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔'' (النحل ۱۲۵)

یعنی بحث و تمحیص کی نوعیت مناظرہ بازی کی نہ ہو، اور مخاطب کو گمراہ ثابت کر کے چپ کرا دینا نہ ہو بلکہ اس کو ہمدردی، شیریں کلامی، اعلیٰ درجہ کے شریفانہ اخلاق، معقول دل لگتے دلائل سے بات سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس کو یہ یقین دلایا جائے کہ آپ یہ سب کچھ اسی کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔

(جاری ہے)

☆☆☆

مجھے ہے جان سے پیاری یہ صبح جس کے لیے
بہا ہے میرے ستاروں کی انجمن کا لہو

فگاروں کا سفر

افسوس! میں اپنے مظلوم پیاروں کی لاشوں سے پھوٹتی آخری مہک سے
اپنے مشام مہکا نہ سکا.....دوسرے جنم کی کہانی.....آزادی کے چراغ کا ایک باب

والد صاحب سے ملنے کے بعد سب سے پہلے پانی پینے کی خواہش شدت سے پیدا ہوئی۔ میرے لیے فوراً ہی لیموں کا شربت بنایا گیا۔ شربت پی کر مجھے کیا محسوس ہوا اس وقت اچھی طرح یاد نہیں، صرف اتنا یاد ہے کہ جتنی خوشی ہونی چاہیے تھی، اتنی محسوس نہیں ہوئی۔ کہاں تو پیاس کا یہ عالم تھا کہ ایک گلاس پانی کے عوض جان دینے کو تیار تھا، کہاں یہ بات کہ خوش ذائقہ شربت پی کر کوئی خاص لطف نہ آیا۔ اب مجھے پولیس لائنز کے ہسپتال میں لے جایا گیا۔ یہاں ہندو کمپاؤنڈر میرا واقف تھا۔ کچھ مدت پہلے اسے فارسی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تھا اور میں نے اُسے چند سبق پڑھائے تھے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ہسپتال میں مجھے معلوم ہوا کہ مرا جسم بھی آگ سے جلا ہے اور سر پر اچھا خاصا زخم آیا ہے۔ اس زخم سے تمام رات خون بہتا رہا اور اس وقت بھی بہہ رہا تھا۔ مرہم پٹی کے بعد مجھے بستر پر لٹایا گیا۔ والد صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ ہندو سکھ سپاہی اور پولیس کے دوسرے افسر آ جا رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر عجیب قسم کی ہیبت ناک خاموشی طاری تھی۔ یہ لوگ کچھ دیر میرے قریب کھڑے ہوتے اور پھر مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے واپس چلے جاتے۔ ایک سکھ سپاہی نے والد صاحب سے بڑی صاف گوئی سے، جو مجھے اچھی لگی، کہا:

''ہمیں اس بات کا تو ذرا افسوس نہیں کہ آپ مسلمان ہیں اور آپ کے گھر کا صفایا ہو گیا ہے؛ البتہ اس بات کا دکھ ہے کہ افضال حسین جو ایک نہایت خلیق انسان ہے، اس کا گھر تباہ ہو گیا۔''

مجھ سے ان لوگوں نے یہ بھی پوچھا کہ اصل واقعہ کیا تھا؟ جو کچھ گزرا تھا، میں نے صاف صاف کہہ دیا جس پر ہندو عملے نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ صغیر حسین سب انسپکٹر نے خود اپنے گھرانے کو مارڈالا ورنہ انھیں بچایا جا سکتا تھا۔ ادھر پاکستان میں خالو صغیر حسین کے بھائی دبیر حسین سب انسپکٹر پولیس، لاہور سے وائرلیس کے

ذریعے حصار کی پولیس سے بار بار پوچھ رہے تھے کہ صغیر حسین سب انسپکٹر پر کیا بیتی؟ ادھر سے غالباً یہ جواب دیا گیا کہ صغیر حسین سب انسپکٹر مسلمان بلوائیوں میں شریک ہو گیا تھا، اُن کے ساتھ مارا گیا اوراس کے گھر والوں کا کوئی سراغ نہیں ملا..... حصار پولیس کا یہ جواب دبیر حسین صاحب نے انہی دنوں غالباً پاکستان ٹائمز میں شائع بھی کرایا تھا کہ کس طرح بھارتی پولیس دروغ گوئی سے کام لے رہی ہے۔

والد صاحب عالم بے قراری میں مجھ سے کہہ رہے تھے:

''بیٹا، تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگا لو، تمام رات جاگتے رہے ہو۔''

لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اتنے میں سنا کہ ہمارے گھر سے لاشوں کا ٹرک آ گیا ہے اور لاشیں مردہ خانے میں پوسٹ مارٹم کے لیے اتاری جا رہی ہیں۔ مردہ خانہ ہسپتال سے پچاس ساٹھ قدم کے لگ بھگ تھا۔ مجھے کھڑکی میں سے مردہ خانہ صاف نظر آ رہا تھا۔ والد صاحب نے لاشیں دیکھنا چاہیں، لیکن انھیں اجازت نہ ملی۔ میں اس وقت بالکل بے حس ہو چکا تھا۔ مجھ میں قطعاً یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ اپنے پیاروں کا آخری دیدار کرلوں۔ میرے عزیز ماموں تجمل حسین صاحب نے نزدیک جا کر لاشوں کو ٹرک سے اترتا ضرور دیکھا۔ انہی سے معلوم ہوا کہ لاشوں میں ایک خاتون رضیہ زندہ نکلی ہے جسے سول ہسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ ماموں تجمل حسین صاحب نے بعد میں پولیس افسران سے اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ کفن دفن کے لیے لاشیں ان کے حوالے کر دی جائیں لیکن انھیں اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ گرمی کا موسم تھا، رات کو سونے کے لیے میرا پلنگ باہر نکالا گیا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور میرے پلنگ سے صرف چند گز دور زمین پر میرے پیاروں کی لاشیں پڑی تھیں جو مجھے صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ اداس رات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ اس رات سے قبل کی رات بھی میں نے اپنے پیاروں کی لاشوں کے درمیاں گزاری تھی لیکن اس رات اوراس رات میں بہت فرق تھا۔ پہلی رات مجھے اپنی جان کی زیادہ فکر تھی، اس لیے میں خود کو بھی مردہ تصور کر رہا تھا اور مجھے ہر لحظہ خیال آتا کہ بس کچھ دیر کی بات ہے، میں بھی انہی لاشوں میں شامل کر دیا جاؤں گا۔ لیکن آج کی رات خود کو محفوظ خیال کر رہا تھا اسی لیے اپنے عزیزوں کی لاشوں کا یوں بے کس پڑا رہنا مجھے شدت سے محسوس ہوا۔

رات کے ساڑھے بارہ کا وقت ہو گا۔ والد صاحب میرے برابر والے پلنگ پر لیٹے ہوئے بہت دیر سے کروٹیں بدل رہے تھے اور غالباً ابھی اُن کی آنکھ لگی تھی۔ ساری فضا پر بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آج مجھے ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا اور چاندنی دونوں ہی کڑوی لگ رہی تھیں، بس ایک رات قبل ہی کی بات

ہے، یہ سب لوگ زندہ تھے۔ گھر میں کس قدر چہل پہل تھی .....اور آج اس اداس چاندنی رات میں وہ سب میرے سامنے مردہ لیٹے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آواز دوں: ''اے ظہیر، اٹھو، مجھ سے کوئی بات کرو..... مستقبل کا پروگرام بناؤ.....تم نے بی اے کا امتحان تو دے ڈالا ہے، کامیاب بھی ہو جاؤ گے ..... پاکستان چل کر کون سی لائن اختیار کرنی ہے؟''

کبھی جی چاہتا اپنے چھوٹے بھائی اظفر کو پکاروں: ''بھئی تم اچھے میرے بھائی ہو، مجھے تکلیف میں چھوڑ کر خود آرام سے پڑے سو رہے ہو۔''

کبھی مجھے اپنی امی کا خیال آتا: دیکھیے امی، آپ نے پرسوں تمام رات میرے سرہانے دعائیں مانگتے گزاری تھی اور اب جبکہ آپ کی امداد کی سخت ضرورت ہے، آپ مجھ سے ناراض ہوگئی ہیں۔''

کبھی میری نظر خدیجہ کو تلاش کرتی: ''واہ بھئی واہ تم اچھی رفیقۂ حیات ہو.....میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور تمھیں اس کی خبر تک نہیں۔''

اور جب میں ان سب سے مایوس ہو جاتا، تو مجھے اپنی شیر خوار بیٹی مسرور بانو کا خیال آتا: ''میری جان، میری لاڈلی! یہ سب لوگ سنگدل ہو گئے ہیں، تم ہی دوڑ کر میرے سینے سے آ لگو۔''

میں انہی خیالات میں گم تھا کہ دو کتوں کو لاشوں کی طرف جاتے دیکھا۔ میں گھبرا کر پلنگ سے اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی ایک طرف سے آواز آئی:

''خبردار اٹھنے کی کوشش مت کرنا؛ ورنہ.....''

اتنے میں سامنے کوارٹروں سے ہسپتال کا کمپاؤنڈر نکل آیا:

''مشکور صاحب آپ لیٹے رہیں۔ کوئی بات نہیں، میں جو کہہ رہا ہوں کہ آپ لیٹ جائیں۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی آہستہ سے کمپاؤنڈر پلنگ کے پاس آ بیٹھا۔ میں نے پوچھا۔

''یہ خبردار کہنے والا کون تھا؟''

''کوئی نہیں، پہرے والا سپاہی تھا۔'' اس کے بعد خاموش کچھ دیر میرے پاس بیٹھا اور تاکید کر کے واپس اپنے کوارٹر میں چلا گیا:

''آپ کو بستر سے اٹھنا نہیں چاہیے، ورنہ سر کے زخم کو نقصان پہنچے گا۔''

اتنے میں والد صاحب بھی بیدار ہو چکے تھے۔ میں نے اُن سے اور انھوں نے مجھ سے لاشوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، تاہم ہم دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں چرا کر سامنے پڑی لاشوں کو برابر دیکھے جا رہے تھے۔ اسی کرب میں صبح ہو گئی، ناشتے میں میرے لیے کچھ دودھ آیا، لیکن مجھ سے ایک گھونٹ سے زیادہ پیا نہ جا سکا۔

میں نے والد صاحب سے پوچھا:

''لاشوں کا کیا بنے گا؟''

''کہتے ہیں ان کا پوسٹ مارٹم کیا جائے گا۔''

تمام دن لاشیں اسی طرح دھوپ میں پڑی

رہیں، ان کا کوئی پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ دوپہر کے وقت والد صاحب غیر معمولی طور پر افسردہ میرے پاس آئے۔ میں نے پوچھا:

''کیابات ہے؟''

کہنے لگے: ''تمھاری ماں کے کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں۔ بھنگی انھیں اتار کر میرے پاس لایا اور کہنے لگا: ''میر صاحب، مجھے آپ کے گھر کی لاشوں سے یہ امانت ملی ہے، اسے لے لیجیے، کام آئے گی ......''

والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے کہا:

''پھر''

''پھر کیا، میں سوچ رہا ہوں کہ ایک معمولی ذات کے بھنگی کو انسانیت کا اتنا خیال اور......''

والد صاحب نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر موضوع بدلنا چاہا۔ اسی اثنا میں کسی نے آ کر اطلاع دی کہ لاشوں کو دفن کرنے کے لیے ٹرک منگایا ہے کیونکہ حکام کا خیال ہے لاشیں متعفن ہو رہی ہیں۔ میں تعفن کا لفظ سن کر عجیب طرح کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے ابھی تک لاشوں کی طرف سے بدبو کا جھونکا آتا ہوا محسوس نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ٹرک آیا اور میرے پیاروں کی لاشیں اٹھا کر لے گیا۔ جس وقت ٹرک ہسپتال کے سامنے سے گزرا، میں نے سانس روک لی، میں چاہتا تھا ان بے گناہ لاشوں کی بدبو میری ناک میں نہ جائے، لیکن جیسے ہی والد صاحب نے مجھے سانس روکے ہوئے دیکھا، فوراً چلا کر کہنے لگے:

''ارے بیٹا، سانس کیوں روک لی، یہ لاشیں تو مہک رہی ہیں۔''

اس اثنا میں ٹرک دور جا چکا تھا۔ افسوس، میں اپنے مظلوم پیاروں کی لاشوں سے پھوٹتی ہوئی آخری مہک سے اپنے مشام کو مہکا نہ سکا۔ میرے خوف نے مجھے اس نعمت سے بھی محروم رکھا۔ دراصل میں اس وقت بھی بری طرح خودغرضی میں مبتلا تھا اور ہر حقیقت کو اپنی جان کے لیے مصیبت سمجھ رہا تھا۔ رات آئی اور چاند بھی اس کے ساتھ نکلا۔ آج پھر وہی جگہ تھی اور چاند کی چاندنی، جونہی میری نظر مردہ خانے کی طرف اٹھی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آج میرے پیاروں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ کل رات یہ ساری فضا اپنی تمام اداسیوں کے باوجود آباد تھی۔ میری پیاری ننھی بیٹی، میری قابل صداحترام ماں، میرا راج دلارا بھائی، میرا نہایت عزیز دوست ظہیر، میری غیور بہن نفیس، میری ماما سے بھری خالہ، میرے ماموں، نانا، نانی مجھے دیکھ رہے تھے...... ہائے یہ سب عزیز کل یہاں کھلی فضا میں پڑے تھے اور آج ان کے جسموں کو مٹی نے ڈھانپا ہوا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے بری طرح وحشت ہوئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''خبردار۔'' یکا یک آواز گونجی اور اس آواز کے ساتھ ہی کمپاؤنڈر اپنے کوارٹر سے برآمد ہوا، مجھ

سے کہنے لگا:

''مشکور صاحب، کیا کرتے ہیں، آپ لیٹ کیوں نہیں جاتے؟'' یہ کہہ کر وہ میرے پاس آیا اور والد صاحب سے اس طرح مخاطب ہوا:

''میر صاحب، میں آج مشکور کے پاس ہی سوؤں گا۔'' ہمارے منع کرنے کے باوجود تمام رات میرے برابر لیٹا رہا۔ صبح کو والد صاحب سے کہنے لگا:

''میر صاحب، آپ جانتے ہیں، پاس ہی جیل میں مسلمانوں کے لیے کیمپ قائم ہو گیا ہے۔ آپ آج ہی وہاں چلے جائیں۔''

والد صاحب نے بعد میں مجھے بتایا کہ کمپاؤنڈر تمام رات اس لیے ہمارے پاس رہا کہ ہندو پولیس نے آپس میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ رات دونوں باپ بیٹوں کو گولی مار کر ختم کر دیا جائے۔ اسی دن دوسرے مسلمان بھی جو پولیس لائنز میں موجود تھے، کیمپ میں آ گئے۔ کیمپ آ کر ہمیں اپنے محفوظ ہونے کا زیادہ احساس ہوا۔

کیمپ جیل کی عمارت میں قائم ہوا تھا۔ اس کی چار دیواری مضبوط اور اونچی تھی چند کمرے بھی ٹھیک حالت میں تھے۔ حصار شہر کے مسلمان اپنے اپنے محلوں میں موجود تھے جو رفتہ رفتہ ایک محلّہ بنتا چلا گیا۔ میں چونکہ خود وہاں نہیں تھا اس لیے صحیح طور پر نہیں بتا سکتا کہ مسلمانوں نے یہ دن کس طرح گزارے، بعد میں جب یہ لوگ بھی کیمپ میں آ گئے، تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے بجلی کے کھمبے توڑ توڑ کر مورچے بنائے اور حملہ آور ہندوؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہندو پوری طرح مسلح ہو کر حملہ آور ہوئے لیکن اس کے باوجود انھیں کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ خدا کا شکر ہے ہماری قوم یوں عام زندگی میں خواہ کیسی ہی بری ہو، لیکن جب کوئی وقت پڑتا ہے تو اس میں بلا کی یکجہتی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ بڑے حوصلے اور استقامت سے حصار کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے پے در پے حملوں کا مقابلہ کیا۔ آخر میں بھارتی فوج کی مدد سے مسلمانوں کے مورچے توڑے گئے اور بڑے جتنوں سے شہر کے مسلمانوں کو کیمپ منتقل کیا گیا۔ جب تک یہ لوگ کیمپ میں نہیں آئے ہم تقریباً روزانہ شہر کی طرف سے آگ اور دھواں اٹھتا دیکھتے اور ان کے حق میں دعائیں کرتے رہے۔ کبھی انجانے خوف سے ہمیں یہ خیال آتا کہ اب کیمپ میں ٹھہرنے والوں کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ روزانہ اطلاع ملتی کہ آج رات کیمپ پر حملہ ہوگا، ذرا ہوشیار رہنا.....اور اس طرح عموماً رات کی نیند حرام ہو جاتی۔

کیمپ میں جب کبھی خطرے کا الارم ہوتا، میں اللہ اکبر کا ورد کرنے لگتا۔ مجھے ان دو لفظوں نے بہت بڑا سہارا دیا۔ اللہ سے کوئی بڑا نہیں، بس پھر ڈر کس کا ہے، یہ سوچتے ہی سارا خوف میرے دل سے دور ہو جاتا۔

ہم اس کیمپ میں یکم ستمبر سے یکم نومبر تک رہے۔ غالباً ستمبر کے وسط میں ہمیں کسی نے اطلاع دی کہ

میرے خالہ زاد بھائی ظہیر اور خالہ زاد بہن نفیس بانو کے ماموں سید ممتاز حسین کو بھی کرنال میں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ ظہیر کی منگیتر حسنیٰ کے والد تھے۔ جی ہاں اس حسنیٰ کے والد جس نے خاموشی کے ساتھ اپنے ہونے والے دولہا کے باپ کے پستول کی گولی کھا کر جام شہادت نوش کیا۔ تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

ماموں ممتاز حسین صاحب کے قتل کی تفصیل یوں ہے کہ وہ صدر کرنال میں اپنے ذاتی مکان میں رہتے تھے۔ نواب احسان اللہ خان صاحب سے ان کے مراسم تھے، ان کے پاس اکثر اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ہماری ممانی کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا، اس لیے گھر پر تنہا رہتے تھے۔ نواب احسان اللہ نے جب حالات مخدوش دیکھے تو ممتاز صاحب سے کہا کہ اب آپ کا اپنے گھر میں تنہا رہنا مناسب نہیں۔

موصوف نے جواب دیا: ''نواب صاحب! میں اپنا گھر اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں، میری بہن خیر النسا (ظہیر کی والدہ) کا گھر بھی میرے گھر کے ساتھ ہے۔ اس میں ظہیر اور نفیس بانو کی شادیوں کا سامان پڑا ہے۔ بہن کیا کہے گی۔''

ایک دوپہر ممتاز صاحب نواب صاحب کے گھر سے آئے اور حسب معمول تالا کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوئے، بدمعاشوں نے انھیں گھیر لیا۔ قاتلوں کے پاس مہلک ہتھیار تھے۔ ممتاز صاحب نہتے تھے، اُن کی گردن اور ہاتھوں پر کئی زخم پائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انھوں نے کئی وار اپنے ہاتھوں پر لیے۔ ان کے گھسٹتے ہوئے ہاتھوں کے نشان دیواروں پر بھی تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ قاتلوں سے مقدور بھر نبرد آزما رہے۔ ممتاز صاحب پولیس میں تھانیدار رہ چکے تھے، نہایت شعلہ بیاں مقرر تھے۔ ہندی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ اردو تو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ سانولا سلونا رنگ، چھریرا بدن، آنکھوں میں خلوص اور محبت کا نشہ اور ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم۔ ان کی ہمدردی کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ غالباً ۱۹۴۰ء میں میرے والد محترم کو ترقی کا امتحان دینے کے لیے پھلور جانا تھا۔ امی کے اصرار کے باوجود والد صاحب روپیہ جمع کرنے کے کبھی قائل نہیں ہوئے، اس لیے سوال یہ درپیش تھا کہ گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟ ماموں ممتاز صاحب کو اس پریشانی کا علم ہوا تو انھوں نے امداد کرنے کا وعدہ کیا اور اس طرح ہر ماہ ہمیں ان کی طرف سے وقت پر مدد پہنچتی رہی۔ بعد میں امی نے اس رقم کو واپس کرنا چاہا تو مسکراہٹ کے ساتھ آبدیدہ ہوئے اور کہنے لگے:

''بانو! کیا تو مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتی؟''

میں جب بھی ماموں ممتاز صاحب کا تصور ذہن میں لاتا ہوں، مجھے ہمدردی، علم و دانش، وقار اور مہر و مروت کا ایک مجسمہ نظر آتا ہے۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
اور پھر خیال آتا ہے پاکستان کے قیام میں

بوڑھوں کا خون بھی شامل ہے، لیکن یہ خون کس قدر جوان، تازہ اور غیرت مند تھا جس نے جوانوں کے خون سے کسی طرح کم ایثار اور قربانی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

میرے والد سید افضال حسین صاحب کی شگفتہ مزاجی مشہور ہے اور ان کی طبیعت کا یہ رنگ مصیبت کے وقت بھی جوں کا توں قائم رہا۔ میں نے کیمپ میں رہتے ہوئے اور پاکستان آنے کے بعد بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔ جو لوگ میرے والد سے ملے ہیں، وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے، صرف خلوت نے ان کے آنسوؤں کی آب و تاب دیکھی ہے۔ یہاں والد صاحب کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ جب یکم نومبر کو کیمپ سے ہم لوگ پاکستان جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے، تو سب لوگ اپنا تھوڑا بہت سامان اٹھائے ہوئے تھے، کچھ لوگ سامان کی وجہ سے خاصے پریشان تھے۔ اس وقت والد صاحب نے میرے پاس آ کر کہا:

''بیٹا! اداس کیوں ہو؟ دیکھو تو سہی ہم کتنے ہلکے پھلکے جا رہے ہیں۔''

میں چپ ہو رہا۔ وہ پھر بولے: ''دیکھو جی، سینہ تان کر چلو۔ ہندو یہ نہ سمجھیں کہ ہماری ہمت جواب دے گئی ہے۔''

کیمپ سے ریلوے اسٹیشن کا فاصلہ کم و بیش ایک ڈیڑھ میل ہوگا۔ بیماری اور زخموں کی وجہ سے میرے چہرے پر کچھ تھکن کے آثار دیکھے تو فرمانے لگے:

''یار مشکور! ہمت سے کام لے، تو نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا۔'' پھر فوراً ہی محبت بھرے لہجے میں کہنے لگے: ''بھئی میں تمھیں اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتا، لیکن یہ بات کچھ اچھی نہیں لگے گی۔''

والد صاحب کے ان الفاظ نے برقی رو دوڑا کر مجھ میں نئی جان ڈال دی۔ اور پھر آخر تک ذرا بھی تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ ٹرین دس گیارہ بجے کے قریب روانہ ہوئی اور دو نومبر کو چار بجے صبح ہم پیارے پاکستان کی دل نواز سرحد میں داخل ہوئے۔ راستے میں اگرچہ ہمیں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، لیکن ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہا کہ اب ٹرین رکی اور اب ہمیں قتل کیا گیا بلکہ جب صبح کو ہم پاکستان میں داخل ہوئے تو یہاں کے لوگوں نے نعرے بلند کیے جسے میں نے یہ سمجھا کہ ہندو حملہ کر رہے ہیں، مگر جب بتایا گیا کہ یہ آواز مسلمانوں کی ہے، تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے دوبارہ جنم لیا ہے..... اور میری تاریخ پیدائش ۲ نومبر ۱۹۴۷ء ہے۔

☆☆☆

برکتوں والی رات

رمضان کی ہے آخری عشرے کی طاق رات
اک رات! ساری راتوں سے افضل ترین رات
کہتے ہیں اس کو برکتوں والی عظیم رات
یہ رات! مغفرت کی، عبادت کی رات ہے
جو دوکرم کی، رحم و سخاوت کی رات ہے
یہ رات ، شام ہو گی سحر تک سلامتی!
آتے ہیں فرشِ خاک پر اس رات جبرئیل
اذن خدا سے اور فرشتوں کو لے کے ساتھ
اور بانٹتے ہیں لوگوں میں رزق و حیات و موت
اجر و ثواب، رحم و کرم، مغفرت، نجات
ہوتا ہے طے شدہ جو شہِ ذوالجلال کا!
اس رات ہی شروع ہوا قرآن کا نزول
اترے تھے جبرئیل ؑحرا کے مقام پر
قرآن ہی تو رشد و ہدایت ہے، نور ہے
رحمت ہے، مغفرت ہے، ثواب و نجات ہے
قرآن ہی تو برکتوں والی کتاب ہے
ہے خیر اور سلامتی، لطفِ حیات ہے
ہم خوش نصیب ہیں کہ ہے رحمت ملی ہوئی
اتنی عظیم رات ہمیں اس نے بخش دی
اس رات مغفرت کی، دعا کیوں نہ کیجیے!!
اس رات اس کا لطف و کرم کیوں نہ لوٹیے !!

شمیم فاطمہ

دھرتی کی اداسی

تو ہی زخموں کا مرہم ہے، تو ہی درد کا درماں ہے
تو ہی ہے ہنگامۂ ہستی، تو ہی زیست کا ساماں ہے

تیری روشن پیشانی پہ کیسا داغ یہ ابھرا ہے
تیرے در و دیوار پہ جاناں وحشت کیسی رقصاں ہے

تیرے پیڑوں کی شاخوں سے ایک اداسی لپٹی ہے
تیرے دریاؤں کی لہروں میں اک سسکی پنہاں ہے

بھیگ رہا ہے تیرا دھانی آنچل تیرے اشکوں سے
تیری کلائی میں چوڑی، نہ مانگ میں تیری افشاں ہے

کچھ عرصے سے تیرے اندر ایک عجیب جو ہلچل ہے
کس سیلاب کا دیباچہ ہے کس طوفان کا عنواں ہے!

دیکھ رہی ہے اس منظر کو خالی خالی آنکھوں سے
اک تصویر جو اس گھر کے دروازے پر آویزاں ہے

جھیل لے یہ دکھ ہنستے ہنستے، سہہ لے سب خاموشی سے
تاریکی میں آج تلک ہے کل تو روشن و تاباں ہے

شمیم فاطمہ

پیاری دوست کے لیے

جب وقت سرکتا جائے گا
ہاتھوں سے نکلتا جائے گا
یہ آج کا ہر پل، ہر لمحہ
جب ماضی بنتا جائے گا
جب زیست کے سارے لمحوں کی
ترتیب بدلتی جائے گی
جب جیون سنگ نئی دنیا
نیا روپ دکھانے آئے گی
پھر دل کے گہرے سمندر میں
مجھے یاد تمہاری آئے گی!!
جب لوگ وفائیں چھوڑیں گے

جب قول نئے ''اقرار نئے
کچھ خواب نئے اور باب نئے
جیون پر چھاتے جائیں گے
ایسے میں اندھیری راتوں میں
تنہائی کی برساتوں میں
کچھ پیار بھرے اخلاص بھرے

جذبات مجھے تڑپائیں گے
ایسے میں مری تنہائی میں
مجھے یاد تمہاری آئے گی!!

جب آنکھ میں آنسو آئیں گے
دل شکر سے بھرتا جائے گا
تاریک شبوں کی چاندنی میں
جب سر رکھ کر میں سجدوں میں
اشکوں کے نیل بہاؤں گی!!
آئے گا حوالہ پیار کا جب
سب دوست مجھے یاد آئیں گے
ایسے میں محبت پیار بھری
معصوم سی بھولی بھالی سی
ہونٹوں پہ لیے مسکان کوئی
اک دوست مجھے یاد آئے گی

مجھے یاد تمہاری آئے گی!!

(عذرا مریم خان)

یہی تو جنت کا راستہ ہے

خورشید بیگم کی میت سامنے چارپائی پر پڑی تھی۔ منہ سفید میلی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چھوٹے سے صحن میں پندرہ بیس عورتوں میں سے آنسو پونچھنے والی تو شاید ایک آدھ ہو لیکن پچھاڑیں مار مار کر رونے والا کوئی بھی نہ تھا۔!!

یہ نہیں کہ مرنے والی اللہ معاف کرے کوئی عیب دار خاتون تھی۔ نہ نہ نہ۔ بالکل نہیں، ایسی کم گو، نیک اور پاکباز خاتون کہ دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں بلکہ یہ کہ اس کی برادری بہت مختصر تھی۔ میاں کو دنیائے فانی سے گئے ساتواں سال تھا!!

سسرال میں گنتی کے دو چار لوگ تھے جن سے میاں کی زندگی میں بھی کم کم ہی رابطہ تھا بعد میں کون کسے یاد رکھتا ہے؟ رہا میکہ تو ایک بھائی اور لے دے کے ایک بہن۔

بڑی بہن خورشید تھی تو چھوٹی کا نام ماہ پارہ۔ اسکی شادی کسی مشہور کاروباری شخصیت سے ہوئی تھی۔ کہنے سننے کی بات تو یہ تھی کہ میاں سے ماہ پارہ کا شادی سے پہلے وہی تعلق تھا جو مالک اور ملازم کا ہوتا ہے۔ لیکن خورشید بیگم اور ماہ پارہ کی عمر میں کم از کم سترہ سال کا فرق تھا۔ جب دور پار کے ایک دیہات میں رہنے والے ماسٹر جی سے خورشید بیگم کا بیاہ ہوا اور وہ رخصت ہوئیں تو ماہ پارہ پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہی تھی۔

خورشید بیگم کی شادی کے دسویں سال ان کا میاں ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گیا۔ شادی کے ان دس سالوں میں ان کی اپنی چھوٹی بہن ماہ پارہ سے جتنی ملاقاتیں ہوئی تھیں وہ گننے بیٹھو تو انگلیاں زیادہ تھیں اور ملاقاتیں کم۔ ہاں اتنا سب جانتے تھے کہ خورشید بیگم کم گو اور مدبر قدرے سانولے رنگ کی فربہی مائل خاتون تھیں تو ماہ پارہ گورے رنگ کی تیز طرار چھریرے بدن اور ناز و انداز کی مالک۔

ماہ پارہ دل کی اچھی تھی۔ خورشید بیگم کے دمے کی دوائی کا خرچہ اس نے اپنے ذمہ لیا ہوا تھا۔ بھانجے اور بھانجی کو ابھی اکثر کھلونے یا عید بقرعید پر تحفے بھجوا دیتی۔

خورشید بیگم کے دونوں بچوں چودہ سالہ منظور عرف بائی جان اور نبیلہ عرف بلے نے اپنی خالہ ماہ پارہ کو دیکھا تو ایک آدھ دفعہ ہی تھا لیکن تحفے تحائف کی بدولت نام اکثر کانوں میں پڑتا تھا۔

رہا خورشید بیگم کا بھائی! مظہر اقبال، بی اے بی ایڈ دل کا وہ ماہ پارہ سے بھی اچھا تھا مگر کانوں کا کچا۔ اپنی

بہن سے پیار بہت تھا مگر دل ہی دل میں۔ اپنی بیوی تنزیلہ کی فراہم کردہ معلومات اور ''فرمودات'' کی روشنی میں اس پیار کے اظہار کے لئے وہ حددرجہ محتاط رہتا تھا۔

مظہر اقبال کے مالی معاملات اور حالات خورشید بیگم سے قدرے بہتر تھے لیکن ماہ پارہ سے بہت نیچے۔

خورشید بیگم ایک کمرے کے کرائے کے گھر میں رہتی تھیں جہاں پر اکثر اوقات بنیادی ضروریات زندگی بھی منہ پھیر لیتی تھیں۔

سرکاری نل کے نیچے سارا سارا دن ٹب پڑا پانی کی ایک بوند کو ترستا اور غریب کے گھر کی طرح خالی ہی ملتا۔

کمرے میں ٹیوب لائٹ تھی لیکن مختصر سا برآمدہ اور صحن ایک چھوٹے سے زیرو بلب کی ملگجی روشنی میں رات تو رات دن کو بھی میلے میلے نظر آتے۔

مالک مکان کا مزاج سخت اور انداز جارحانہ رہتا۔ اس کی بیوگی پر کبھی اس نے ترس نہ کھایا۔ بہن ماہ پارہ چار سو میل دور رہتی تھی جبکہ فون پر دو چار ماہ کے بعد رابطہ کر لیتی اور حال احوال دریافت کر لیتی۔

رہا اکلوتا بھائی مظہر اقبال۔ بی اے بی ایڈ وہ تھا ہی سرکاری سکول میں ٹیچر۔ اس کی اپنی دو جوان جہان بیٹیاں تھیں اور زبان کی کڑواہٹ لئے بیوی گھر میں مالک ومختار تھی۔ گو کہ مالی حالات ان کے بہت اچھے نہ تھے مگر ذاتی مکان تھا۔ کرائے پر دکان بھی دے رکھی تھی۔ چاہنے کے باوجود ماہ پارہ کی طرح وہ بہن کی بیوگی میں اس کی مدد نہ کر سکتا۔ اس کا گھر محض بیس پچیس منٹ کی مسافت پر تھا لہٰذا سال میں دو ایک چکر لگا تا۔ جی بھر کے بہن سے باتیں کرتا۔ جاتے جاتے بھانجے منظور اور بھانجی کو اپنی حیثیت کے مطابق سو پچاس روپے تھما جاتا اور بس۔ کون رو رو کر جانے والی کی یاد میں ہلکان ہوتا۔ محلے کی عورتیں تو مسلسل بیس بائیس دن سے خورشید بیگم کی حالت سے مایوس تھیں اب کے ایسا دورہ پڑا کہ جان لے کے ہی ٹلا۔

ماہ پارہ انگلینڈ گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے کسی اور ملک کا پروگرام بنالیا۔ اس کا نمبر یہاں کسی کے پاس تھا نہ اس نے جانے کے بعد رابطے کی ازخود ضرورت محسوس کی۔ محلے والیوں نے نہلا دھلا کر میت کو کفنایا۔ اکلوتے بھائی کی بیوی تنزیلہ اپنی بہنوں کے ساتھ آئی تھی۔ ہر کوئی انہی سے گلے مل کر افسوس کا اظہار کرتا۔ رٹے رٹائے تعزیتی کلمات اور بس۔

پہلا کھانا ہی یہاں کا آخری کھانا جو مظہر اقبال نے دیا۔ دوسری صبح ناشتے میں وہی رات کے بچے چاول کھا لیے گئے۔ گھر کی چابیاں مالک مکان کے حوالہ کیں ضروری سامان پڑوسیوں کے ایک فالتو کمرہ میں رکھوا کر مظہر اقبال اس کی بیوی، سالیاں اور خورشید بیگم کے دونوں بچے بھی ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔

آج مرے اور کل دوسرا دن۔

یہاں کون سا عدت کا معاملہ تھا یا سوگ کے تین دنوں کی گنتی ضروری تھی۔ جو سوگ غم تھا وہ منظور اور اس

کی بہن نبیلہ عرف بلے کے ننھے منے دل میں ہی تھا۔
سوکیسی صف اور کس کی یاد میں؟
اللہ اللہ خیر صلاّ

☆.....☆.....☆

چودہ سالہ منظور باپ کے مرنے کے وقت سات سال کا تھا۔اگلے سات سالوں میں ماں کی بیماری اور زمانے کے سلوک نے اس کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔جبکہ نبیلہ عرف بلے پیدا ہی بن باپ کے ہوئی تھی دنیا میں جب آئی تو باپ تھا نہ اس کی کمی محسوس ہوئی۔ہاں ماں کی بیماری،گھر پر ہر وقت سوگواری کی کیفیت طاری رکھتی۔اسے چپ رہنا پسند نہ تھا اور اس کے بائی جان منظور کو بولنا قطعاً برداشت نہ تھا۔سو بائی جان منظور کا ایک دفعہ سرخ سرخ آنکھیں نکالنا ہی اسے چپ کروانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔تھی وہ چلبل سی پارے کی طرح ہلچل مچائے رکھتی۔

چھ سات سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے؟؟

☆.....☆.....☆

''یہ پلیٹیں اور گلاس دھو کر سکھا کر الماری میں رکھ دینا، ہر وقت کھیلتے ہی نہیں اپنے لوگ کہیں گے ماں مر گئی تو کسی نے مت ہی نہ دی۔''

مظہر اقبال کی بیوی اور نبیلہ کی مامی تنزیلہ نے بچوں کو لا کر تین دن کے بعد لب کشائی کی۔

نبیلہ بدستور بلی کے بچے سے کھیلنے میں مگن رہی۔کبھی خود بھی بلی بن جاتی وہی الٹی سیدھی حرکتیں۔

''اے بی بی! تمہیں کہہ رہی ہوں۔'' مامی نے پاؤں کے انگوٹھے سے نبیلہ کو ٹہوکا دیا۔

''ک.....کیا؟'' وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔

''یہ دو برتن جو نظر آ رہے ہیں یہ دھو دو۔'' لہجہ بہت سخت تھا۔

نبیلہ ہکا بکا برتنوں کے اس ڈھیر کو دیکھ رہی تھی جو صحن کے کھرے میں ایک پہاڑی کی شکل میں جمع تھے۔

''میں دھوؤں مامی؟'' نبیلہ نے ہکلا کر پوچھا۔

''تو اور کسے کہہ رہی ہوں۔'' مامی نے سر پیٹ لیا۔

''مجھے تو برتن دھونا نہیں آتے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''تو دھونا اب سیکھ لو، کام تو کرنا پڑیں گے۔وگرنہ دنیا تھوکے گی لاڈ میں رکھا، کام کوئی نہ سکھایا۔''

نبیلہ کو اتنے برتن دیکھ کر ہول پڑ رہے تھے۔

پتہ نہیں منظور کب کا پیچھے کھڑا یہ سین دیکھ رہا تھا۔

''چلو میں تمہارے ساتھ دھلواتا ہوں۔'' آہستہ سے اس نے کہا اور بہن کو لے کر کھرے پر جا کر بیٹھ گیا۔

''آپ.....'' نبیلہ کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔

''بائی جان آپ برتن کیسے دھوئیں گے؟''

''باتیں مت کرو جیسے میں دھوؤں گا تم بھی ساتھ دھوتی رہنا۔'' منظور نے اسے چپ کرایا۔

بیس پچیس منٹ میں برتن دھل گئے تھے اور الماری میں بھی رکھ دیئے گئے تھے۔

کاموں کی برتن دھونے سے جو ابتدا ہوئی وہ روز بروز لمحہ بہ لمحہ آٹا گوندھنے، جھاڑ پونچھ کرنے، سبزی بنانے ،مصالحہ پیسنے سے ہوتی ہوئی کپڑے دھونے سکھانے ،اتارنے تک آ پہنچی۔

کاموں سے دونوں اتنا نہ تھکتے جتنا مامی کے زہر میں بجھے تیروں جیسے فقرے اذیت دیتے۔

ہر بات پر ''مری ماں'' کا حوالہ لازمی ہوتا، ہر کام اچھا ہو یا برا۔ اللہ بخشے ماں کا سلیقہ بھی ایسا ہی تھا، بھی نتھی ہوتا۔ چھوٹی ہونے کے باوجود نبیلہ کلس کر رہ جاتی اور بائی جان منظور وہ تو سکول سے آ کر بس گونگے ہی بن جاتے۔ زبان پر تالا لیکن آنکھیں شعلے برساتی تھیں۔ جب کوئی برتن ٹوٹتا، آٹے میں پانی زیادہ ڈل جاتا یا کوئی نقصان ہوتا تو مامی کا غصہ آسمان پر پہنچ جاتا۔ ہاں ماموں کے آتے ہی ان کا طنطنہ، غصہ دھیما پڑ جاتا۔

''منظور بیٹا! پڑھائی کیسے ہو رہی ہے؟ اوے بلو !''وہ نبیلہ کو مخاطب کرتے ''تم سارا دن کیا کرتی ہو؟'' کہہ کر ان سے گپ شپ شروع کرتے تو اتنی دیر منظور کی آنکھوں کے شعلے مدھم ہو جاتے اور اب مامی کی آنکھوں میں بھڑکنے لگتے۔

زبان ان کی خاموش لیکن ہاتھ زور زور سے چیزیں پٹختے تھے۔ ماموں کی دونوں بیٹیاں ٹی وی ڈرامہ دیکھتے ہوئے ماں کو دیکھتیں اور پھر ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ہی بٹھا لیتیں۔

☆.....☆.....☆

بالآخر کسی نہ کسی بہانے نبیلہ کو سکول میں داخلہ مل ہی گیا۔ گو کام اب بھی وہی کرتی تھی، برتن جھاڑو پونچھا مگر سکول سے آنے کے بعد۔ مامی کی سخت تاکید تھی کہ ماموں کے آنے سے پہلے پہلے کام مکمل کر لینا۔

منظور قدرے مطمئن تھا جب ایک طوفان برپا ہوا۔ ماموں رکشے سے نیچے گرے اور ہڈی تڑوا بیٹھے۔ سکول کی ماسٹری چھٹ گئی۔ نبیلہ اور منظور کی دو وقت کی روٹی مشکل ہو گئی۔ منظور تو خیر میٹرک کے امتحانات کی تیاری میں مگن تھا۔ نبیلہ کو سارا غصہ بھگتنا پڑتا۔ اب نبیلہ کو ''ماں'' کے ساتھ ساتھ ''کہاں سے کھلائیں، کس باپ کے سر پر عیش'' کا طعنہ پچیس دفعہ سننا پڑتا۔ مامی کی بیٹیاں اس معاملہ میں بڑی سمجھدار تھیں تو کل اللہ مالک ہے، جیسے دلاسے بھی مامی کو خاموش نہ کرا سکتے تھے، جب مامی نے منظور کا آخری پیپر ہونے پر اسے کسی نہ کسی دکان پر ''سیلز مین'' کسی ورکشاپ پر کام سیکھنے، کسی درزی کا شاگرد بن کر گھر کا خرچہ سنبھالنے کا مشورہ دیا۔

ماہ پارہ خالہ نے بھی اس عید پر فون کے رابطے کی بجائے بیمار بھائی کی خبر گیری کا پروگرام بنایا۔ منظور کے ذہن میں تو پھر بھی پارو خالہ کا ہیولا سا موجود تھا لیکن ہر وقت سنجیدہ رہنے والی نبیلہ کو بھی خالہ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔

☆.....☆.....☆

نئی نویلی ،لمبی ،لشکارے مارتی سیاہ شیشوں والی گاڑی حسن آباد کے اس گلی محلے میں کیا داخل ہوئی کہ نبیلہ اور منظور کے بھاگ جاگ گئے۔ان کے دیکھتے ہی پتہ نہیں کیا خون نے جوش مارا کہ خالہ نے پانچ منٹ کے اندر اندر ان کو اپنے ساتھ لے جانے کا الٹی میٹم دے دیا۔ بھانجے، بھانجی کے لئے کپڑے جوتے اور دوسرے تحفے ان کے ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ان کو یہ شہر محلّہ اور ماموں کا گھرانہ چھوڑتے ہوئے اتنا بھی قلق نہ تھا جتنا ماں کے مرنے کے بعد اپنا شہر اور گھر چھوڑتے ہوئے تھا۔

شاید اس میں دوہری مشقتوں کے ساتھ ساتھ وہ ذہنی اذیت بھی شامل تھی جو ہر لحظہ مامی کے فقروں کی شکل میں ملتی تھی۔

نبیلہ نے تو یہ شہر چھوڑنے پر سکون کا سانس لیا جبکہ منظور نے گاڑی میں بیٹھتے ہی با آواز بلند شکر ادا کیا۔

خالہ نے چونک کر منظور کی طرف دیکھا۔

ان کا نوجوان بھانجا کس بات پر اتنا شکر ادا کر رہا تھا۔وہ لاعلم تھیں۔

سات آٹھ گھنٹے کے طویل تھکا دینے والے سفر میں خالہ اپنی مرحومہ بہن کو یاد کر کر کے آنسو پونچھتی رہیں۔اپنے گھر اور گھر کے طور طریقوں سے آگاہ کرتی رہیں۔گزشتہ سالوں میں ملنے کے لئے آنہ سکنے پر بار بار معذرت کرتی رہیں۔

خالہ کی بے پناہ اور تھکا دینے والی مصروفیات کا رونا روتی رہیں۔ان بچوں کی سرگرمیوں کے بارے میں سوال کرتی رہیں۔ جب بھی مامی کے تکلیف دہ رویے کی بات آتی اس کے بائی جان منظور اسے پاؤں سے ٹھوکا دے کر چپ کروا لیتے۔

ایک بات تو بہر حال تھی۔

''تم دونوں بچوں کو اب ہمیشہ میرے ساتھ رہنا ہے۔میں اپنی بہن کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی ہوں۔'' خالہ نے سفر کے اختتام پر جب ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا ان کو مخاطب کر کے کہا۔

''اور یہ..... کہ تمہاری محنتوں، مشقتوں کے دن گزر گئے۔مامی اور خالہ میں بہت فرق ہوتا ہے میرے بچو۔'' خالہ نے دلار سے کہا اور نبیلہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

نبیلہ کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔اس کی آنکھیں بس پھٹنے کو تھیں۔اس کا دماغ چکرایا ہوا تھا۔

''یہ.....خالہ.....کا گھر ہے یا کسی بادشاہ کا محل؟''

☆.....☆.....☆

اندر لاؤنج تک پہنچتے پہنچتے نبیلہ چکنے فرش پر دس دفعہ پھسلی۔اس کے خواب وخیال، وہم وگمان میں بھی ایسا منظر نہ رہا ہوگا۔اب منہ پر ہاتھ رکھے وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کے دیکھ رہی تھی۔کبھی اپنے بازو پر چٹکی کاٹتی، کبھی آنکھیں جھپکتی مگر دل کی حیرانی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔اتنے میں ایک سفید پری اندر کمرے سے آ کر حیرانی سے بولی۔

''وا.....وَ.....ہاؤ سویٹ.....لٹل انوشکا شرما۔''

چھوٹی سی مانو بلی نبیلہ کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ وہ سہم کر خالہ سے جا لگی۔

''ڈونٹ بھی سِلی۔ تنگ نہ کرو میری شہزادی کو۔'' خالہ نے نبیلہ کو ساتھ چمٹا لیا۔

نبیلہ تو اس پری کا لباس دیکھ کر ہی حیران تھی، شلوار قمیض کے علاوہ کون سا لباس پہنا جاتا ہے یہ اس نے ڈراموں، فلموں کے بعد آج دیکھا تھا۔

ننگے بازو، ننگی ٹانگیں، سفید پتلی سی لمبی لمبی شرٹ اور ننگا سر۔

شرم کے مارے نبیلہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

''یہ تمہارا بیڈروم ہے اور یہ ساتھ واش روم ہے۔'' خالہ نے نبیلہ اور منظور کو ان کا کمرہ دکھایا۔

نبیلہ نے تو بس ڈراموں میں ایسا کمرہ دیکھا تھا۔ گلابی وال پیپر گلابی پردے۔ قالین میں بھی اسی رنگ کے پھول تھے۔ کمرے میں چھوٹا سا فریج اور ضروری اشیا بھی موجود تھیں۔ وہ اپنی آنکھیں کھول کھول کر گھر کے اس کمرے کو دیکھ رہی تھی جس میں انہیں زندگی کے باقی دن بسر کرنے تھے۔

البتہ منظور خاموش تھا۔ اس کے چہرہ پر پسندیدگی کی بجائے سوچ ہی سوچ تھی۔

''بائی جان آپ بھی تو کچھ بولیں۔ اب آپ کو کمرہ پسند نہیں آیا؟'' خوشی سے بھرپور لہجے میں بلے نے کہا۔

منظور پھر بھی خاموش رہا۔

''بائی جان یہ.....کیا ہے؟'' بلے نے حیرانی سے دیوار پر لگی بڑی سی سکرین کو دیکھ کر پوچھا۔

اسے ایل سی ڈی کہتے ہیں۔ منظور نے جواب دیا۔

''اسے کیا کرتے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہ ٹی وی کی سکرین ہے اور یہ ریموٹ ہے۔'' منظور نے ناگوار لہجے میں ریموٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹی وی؟؟'' حیرت اور خوشی سے نبیلہ چلائی۔ ''کیا ہم اپنے کمرے میں ٹی وی بھی دیکھ سکتے ہیں؟ ہائے اللہ اس نے تالی بجانے کے انداز میں خوشی کا اظہار کیا۔

''اور یہاں مامی جان بھی نہیں ہوں گی ڈانٹنے کے لئے، کان مروڑنے کے لئے۔'' افسردگی سے نبیلہ نے اپنے کانوں کو چھوا۔

''پتہ نہیں۔'' منظور نے مختصر سا جواب دیا۔

''اور یہ کیا ہے؟ آئے ..... یہ تو فریج ہے۔'' اس نے خوشی کا اظہار چیخ کر کیا۔ ساتھ ہی اس نے ڈرتے ڈرتے فریج کا دروازہ کھولا۔

''ہائے اللہ بائی جان یہ دیکھیں، سیب، انار، انگور اور یہ جوس کے ڈبے۔ یہ اصلی ہیں ناں؟'' مارے خوشی کے وہ رو پڑی۔

''آپ کو پتہ ہے ماموں کے ہاں جب مہمان

آتے تھے مامی پیپسی کی بوتلیں منگواتی تھیں تو میرا کتنا دل کرتا تھا پینے کو۔ اب یہ ساری میری ہیں۔ میری اپنی۔'' وہ ڈھائی لیٹر کی پیپسی بغل میں لیے خوشی سے گھومی۔

اتنے میں خالہ ماہ پارہ اندر آئیں۔

''کیسا لگا اپنا کمرہ آپ کو بچو؟'' انہوں نے بیڈ کے قریب پڑے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بہت پیارا..... بہت ہی پیارا۔'' بہت پر خوب زور دیتے ہوئے نبیلہ نے کہا۔

منظور خلاف توقع خاموش تھا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ انٹرکام ہے۔ اس کا بٹن دبا دیا کرو۔'' خالہ نے انٹرکام ہاتھ میں لے کر کہا۔ اور یہ ساتھ جو بٹن ہے یہ صرف اور صرف میرے بیڈروم کی بیل کا ہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ ہو اس وقت یہ بٹن پش کرنا میرا مطلب ہے دبا دیا کرنا۔ کل تمہیں خود مارکیٹ لے کر جاؤں گی۔ شوز، کپڑے، سکول بیگ اور کتابیں لینے کے لئے۔ تم اب یہاں فارغ نہیں رہو گے۔ سکول جاؤ گے، شام میں ٹیوٹر آئے گا۔ کھیلنے کے لئے بھی آپ کو ڈیڑھ دو گھنٹے ملیں گے۔ سیر کے لئے کہیں جانا چاہو تو مجھے بتانا میں ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دوں گی۔ ٹھیک ہے۔'' انہوں نے نبیلہ کو ساتھ لگا کر پیار سے کہا۔ ''آپا ہوتیں تو خوش ہوتیں۔'' آہستہ سے انہوں نے کہا۔ آنسو کا ایک کونا جھلمل کرتا ان کی پلکوں میں پھنسا ہوا تھا۔

''پہلے یہ میرا بیڈروم تھا۔ پھر جب تمہارے انکل نے نیا بیڈروم بنوایا تو میں نے اسے گیسٹ روم بنوا دیا تھا لیکن اب یہ آپ کا ہے۔ جیسے چاہو کھیلو کودو۔'' جاتے جاتے نظر اٹھا کر انہوں نے اپنے دبلے پتلے بھانجے کی طرف دیکھا، شاید خوراک کی کمی نے ہڈیوں پر گوشت نہیں بننے دیا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے دونوں بچے کیلشیم کی کمی کا شکار ہو گئے۔ ممتا کا اک طوفان ان کے سینے میں اٹھا البتہ اس کے چہرہ پر پھیلی سنجیدگی سے وہ بہت حیران ہوئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''بائی جان تین دن ہمیں یہاں آئے ہوئے ہو گئے ہیں آپ ہر وقت چپ کیوں رہتے ہیں؟ جب آپ چپ رہتے ہیں تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔'' وہ بائی جان سے چمٹ کر بولی۔

''میرے چپ رہنے سے تمہیں زیادہ ڈر لگتا ہے یا مامی جان کی ڈانٹ پھٹکار سے زیادہ ڈر لگتا ہے؟'' منظور نے سوال کیا۔

''''او.....و.....ں'' نبیلہ سوچ میں پڑ گئی۔

پھر اس نے کہا ''مامی جان کی ڈانٹ سے۔'' فوراً ہی تصحیح کی۔ ''نہیں، نہیں آپ کے چپ رہنے سے۔''

''وہ کیوں؟'' منظور نے پوچھا۔

''وہ اس لئے بائی جان کہ جب مامی جان مجھے ڈانٹتی تھیں تو آپ مجھے پیار کرتے تھے۔ ماموں جان مجھے چپ کراتے تھے اور فرحانہ، رضوانہ آپی مجھے ٹافیاں

دیتی تھیں اور میں مامی جان کی ڈانٹ بھول جاتی تھی لیکن جب آپ مجھ سے باتیں نہیں کرتے، چپ رہتے ہیں تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے، پھر میں کس کے پاس جاؤں۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

اس کی بات سن کر پہلی دفعہ منظور کے چہرہ پر مسکراہٹ آئی۔اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔۔

''بائی جان آپ ہنس رہے ہیں؟'' حیرانی سے بلے نے دونوں آنکھیں پٹپٹا کر پوچھا۔

''ہاں.....اس لئے کہ چھوٹی بہنا تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔'' اس نے ریلیکس انداز میں دونوں بازو اوپر کیے۔

''کیا مطلب ہے آپ کا بائی جان؟'' چھوٹی سی منی سی جان بائی جان کی اتنی بڑی بات کو سمجھ نہ پائی۔

''میں واپس ماموں کی طرف جا رہا ہوں۔'' بائی جان نے دھماکہ کیا۔

''ک.....یا.....؟'' بلے چیخی۔

''وہ کیوں بائی جان؟ آپ کیوں جا رہے ہیں؟''

بائی جان نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے۔''بلے تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ میری بات کو نہیں سمجھ پاؤ گی لیکن میں اس لئے واپس جا رہا ہوں کہ مجھے یہاں نہیں رہنا۔''

''کیا آپ کا دل یہاں نہیں لگا بائی جان؟'' بلے نے پوچھا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے، تم بھی اپنا سامان تیار کرلو بس ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔''منظور نے فیصلہ سنایا۔

''میں بھی۔ کیوں بائی جان؟'' اس نے آنکھیں گھما کر کمرے کے چاروں طرف دیکھا یہ نرم گرم بستر، اے سی، فریج، ٹی وی ان کو چھوڑنا ننھی جان کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں بائی جان کے اس فیصلے پر احتجاج بھی تھا۔

''میں نے کہا ہے ناں بہنا، بڑی ہو کر تم ہر بات سمجھ جاؤ گی بس یہ یاد رکھنا کہ مامی جان دل کی بری نہیں ان کے حالات اور مسائل نے انہیں ایسا کر دیا ہے۔ میں ان کا بازو بنوں گا۔ ماموں چل پھر نہیں سکتے ان کا سہارا بنوں گا۔ ماموں کی دونوں بیٹیوں کی شادی ہونے والی ہے، مامی ہر وقت پریشان رہتی ہیں ان کے کام کروں گا۔ ان کا بیٹا نہیں ہے ناں۔ ساری ٹینشن انہیں اس بات کی ہے۔اور.....اور یہ کہ ہمیں اس لئے بھی کہ.....''منظور بات کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمکتی جوت بجھ گئی۔'' اس لئے بھی کہ دولت، اقتدار، عہدہ، شہرت جب یہ کسی کے پاس آئیں اور ان کو نعمت کی بجائے ''استحقاق'' سمجھ لیا جائے تو بندہ قارون اور فرعون کا پیروکار بن جاتا ہے۔ حلال حرام، حیا کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ بلے کو اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی۔ لیکن ماں نے پانچوں وقت نمازوں کے لئے مسجد میں جانے کا عادی

بنایا تھا۔

مسجد میں مولوی صاحب اور قرآن اس کے لئے بڑے دوست بن گئے تھے۔اب بھلا وہ ان دونوں کے سکھائے سبق کو کیسے جھٹلا دیتا؟

''تم دل چھوٹا مت کرو۔'' اس نے بلے کو مخاطب کیا۔''میں اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی نوکریاں بھی کرتا رہوں گا، خواہ جوتے پالش کرنے یا اخبار بیچنے یا موتیے کے گجرے بیچنے کی کیوں نہ ہو۔میرا ایمان ہے کہ اللہ میری کمائی میں اور علم میں اتنی برکت ڈال دے گا کہ تم ہر سہولت کا منہ دیکھو گی۔تنگی کے دن انشاء اللہ بہت جلد گزر جائیں گے۔ چلو اٹھو شاباش، جوتے پہنو، ہم چلنے لگے ہیں۔''

''ابھی۔خالہ کو تو بتایا ہی نہیں۔'' بلے نے کہا۔

''ان کو انٹر کام کیا تھا وہ کسی دوسرے شہر گئی ہوئی ہیں۔میں نے پیغام دے دیا ہے۔''

دونوں بہن بھائی بس سٹاپ پر پہنچے تھے جب خالہ گھر پہنچیں اور انہیں ملازمہ نے منظور کا پیغام دیا۔

وہ جلدی سے موبائل پر منظور کا نمبر پریس کرنے لگیں رنگ ٹون قریب ہی ہو رہی تھی۔

ان کے قدم بے اختیار دونوں کے کمرے کی طرف اٹھے۔نیا موبائل فون بیڈ پر دھرا تھا۔

کمرے کی ہر چیز جوں کی توں تھی۔

کل کی شاپنگ کو کھول کر بھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

جن دو کپڑوں میں بہن بھائی آئے تھے انہی میں واپس چلے گئے تھے۔ان کو پتہ چل گیا تھا منظور کیوں گیا ہے۔

اللہ بخشے ان کے ابا اور جنت مکانی ان کی والدہ کو بھی جب پتہ چلا تھا کہ ماہ پارہ نے سینما کے مالک سے شادی کا فیصلہ کیا ہے تو دونوں نے مرتے دم تک اس کا منہ نہ دیکھا تھا۔اور منظور کون تھا؟؟ انہی کا نواسا۔

حیا اور حلال کے بارے میں اتنا حساس کہ شاید ماں بھی بچے کے بارے میں نہ ہو۔اور تو کچھ نہ ہوا، بس بھانجے کی استقامت کے لئے انہوں نے دونوں ہاتھ بارگاہ الٰہی میں پھیلا دیئے۔اس سے ہٹ کر وہ کیا تحفہ دے سکتی تھیں؟؟

☆☆☆

ام ایمان

بے خوف

کرارے سموسے.....مزیدار سموسے

چٹ پٹے سموسے.....

جو ایک بار کھائے گا بار بار آئے گا

بہت دنوں بعد سموسے والے کی آواز آئی تھی۔ شاید ہفتوں بعد یا شاید مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد۔ میں چونک گئی۔ پہلے تو بڑی باقاعدگی کے ساتھ صبح گیارہ ساڑھے گیارہ کے درمیان اس کی آواز آتی تھی۔ اس کے کرارے سموسوں کی طرح کراری!

چٹوری کا خطاب بچپن سے ملا ہوا ہے۔ لہٰذا چٹ پٹے اور کرارے سموسوں کی آواز پر لپک کر میں کھڑکی سے جھانکتی لیکن نہ میری آواز اس تک پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی میں کوئی اشارہ کر سکتی تھی۔ بس سموسوں والے کی چٹ پٹی اور کراری آواز سنتی اور زیادہ دل تڑپتا تو گیلری سے نکل کر جھانکتی۔

بڑا سا تھال سر پر رکھے جس میں ایک طرف ترتیب کے ساتھ سموسے ایک کے اوپر ایک جمے ہوتے۔ جالی سے ڈھکے ہوئے۔ دور سے ہی نظر آتا تھا۔ تھالی میں ایک طرف کچھ اور بھی رکھا ہوتا تھا لیکن صاف نظر نہیں آتا۔ یقیناً فون ڈائریکٹری کے صفحات سے بنے کاغذی لفافوں کا بنڈل ہوگا۔ اور شاید توازن کے لئے کوئی دو چار چکنے پتھر..... بازو پر تین ٹانگوں والے سٹینڈ کو لٹکائے ہوئے اور اسی ہاتھ سے ایک تھیلا تھامے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے قدموں سے چلتا ہوا آ کر مین بازار کے درمیان کھڑا ہو جاتا پھر دو چار قدم چل کر آواز ضرور لگاتا۔

کرارے سموسے.....مزیدار سموسے

جو ایک بار کھائے گا بار بار آئے گا

دکان دار اور گاہک دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ لیکن کبھی کبھی وہ یوں ہی کھڑا آواز لگاتا رہتا لیکن کوئی اس کے کرارے سموسوں کی آواز پر اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ کافی انتظار کے بعد آخر تنگ آ کر وہ اسٹینڈ کے اوپر سے تھال اٹھا کر سر پر رکھتا اسٹینڈ بازو میں لٹکا کر آواز لگاتا ہوا آگے نکل جاتا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک موٹر سائیکل والے نے اس کو جاتے جاتے آواز دے کر رکوایا اس کی موٹر سائیکل پر اس کی بیوی کے ساتھ تین بچے تھے دو آگے اور ایک بیوی کی گود میں.....شاید ان ہی کی فرمائش پر اس کو رکوایا گیا تھا۔ سموسے اور ان پر چاٹ مصالحہ چھڑک کر دیا۔ بچوں کی بغیر مصالحہ کے یوں ہی ہاتھوں میں تھما دیئے۔ یوں خاندان بھر بے وقت کی

بھوک مٹا کر کاغذ سے ہاتھ صاف کر کے آگے روانہ ہوگیا۔لیکن ادھر اتنے عرصے سے اس نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کچھ دنوں تک تو گیارہ بجتے تو میں اس کی آواز کا انتظار کرتی۔ کراری اور چٹ پٹی آواز کا.....لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میں بھول گئی۔ کسی بھی چیز کو بھولنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟؟

شاید اتنی ہی جتنی کسی نئی چیز کا عادی بننے میں..... سائنس دانوں کی تحقیق بتاتی ہے کہ کسی چیز یا کسی عادت کو ڈالنے میں تین دن اہم ہوتے ہیں اور تین دن کی مشکل کے بعد وہ چیز روزمرہ میں شامل ہوجاتی ہے۔

کرارے سموسے، مزیدار سموسے کی آواز آنا بند ہوگئی تو بس وہ بھول کی دلدل میں اتر گیا۔ یوں بھی میں نے تو اس کے کرارے اور چٹ پٹے سموسے چکھے بھی نہ تھے۔ البتہ اس کی آواز کا کرارہ پن سنا تھا اور مزہ لیا تھا جس نے کئی دن اس کا انتظار کرایا لیکن وہ شاید یہاں کے لوگوں سے مایوس ہوگیا تھا اسی لئے کسی دوسری آبادی کی طرف چلا گیا ہوگا، یہ ہی سوچ کر رہ گئی تھی۔

کراچی کے حالات میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔اس دن بچوں کی وین نے ذرا دیر کی اور میں بالکونی میں کھڑی ہوگئی۔ دعاؤں اور وظیفوں کا سہارا لیے..... نظریں منتظر تھیں بچوں سے پہلے غیر متوقع طور پر سموسے والا نظر آ گیا دور دوسری گلی کی طرف جا رہا تھا۔اس کی آواز کا کرارہ پن ختم تھا۔شاید دور ہونے کے سبب.....بیٹے میں نے سوچا۔ بیٹے کو اشارہ کیا سموسے والے کو تو بلاؤ۔ وہ دوڑ کر بلا لایا۔ دھیرے دھیرے تھکے تھکے قدموں سے وہ چلتا ہوا آ گیا۔ سٹینڈ بازو میں لٹکائے اسی ہاتھ سے سر پر رکھے تھال کو سنبھالے تھا اور دوسرا ہاتھ جس میں تھیلا ہوتا تھا اس سے ایک بچی کا ہاتھ تھامے ہوا تھا۔ چھوٹی سی بچی شاید پانچ چھ سال کی ہوگی۔ سموسے تو میں شاید بچوں سے بھی منگا لیتی لیکن بچی کے بارے میں جو تجسس پیدا ہوگیا تھا۔اس نے مجھے نیچے جانے پر مجبور کر دیا۔

''کیوں بھئی بچی کو کیوں ساتھ ساتھ لیے پھر رہے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''بس باجی جی کیا بتاؤں! بیٹی کو ساتھ نہ لیے پھروں تو کیسے دھندا کروں، اکیلی گھر پر کیسے چھوڑوں؟''

''اکیلی کیوں؟ اس کی ماں کہاں ہے؟''

''وہ جی شہر پر تو قاتل عفریت کا سایہ ہے جی، میری بیوی کی بھینٹ لے لی ہے اس نے.....''

اچھا خاصا مرد درد دل سے بلک بلک کر رونے لگا۔

اُف کس قدر مشکل ہے کسی مرد کو روتے دیکھنا! میں کچھ سہم سی گئی۔ بچی کی طرف مڑ کر دیکھا وہ چبوترے پر بیٹھ گئی تھی اور دو تین چکنے پتھروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ باپ کے رونے کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔شاید اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔

''اچھا روتو نہیں.....کیا ہوا تھا بتاؤ تو سہی۔'' بچی

کے اثر نہ لینے پر مجھے ذرا تسکین سی ہوئی تھی۔

''بس جی میری بیوی گلی میں جھانک کر دیکھ رہی تھی، نہ معلوم کہاں سے اندھی گولی آئی سیدھا سر کو نشانہ بنایا جی..... میری بیوی تو دوسرا سانس نہ لے سکی۔ ساتھ میرے ہونے والے بچے کو بھی لے گئی۔ آخری مہینہ تھا۔'' وہ پھر بلکنے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے دلاسا دوں۔ زخموں کو کریدنا کتنا تجسس آمیز لگتا ہے لیکن مرہم رکھنا بلا کا مشکل!

''میں کیا کر سکتی ہوں اس کے لیے؟'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''اچھا مشورہ'' دل نے کہا۔

''بچی کا کوئی خالہ پھوپھی چاچی نہیں ہے؟''

''نہ جی میں تو اکیلا روزی کمانے آیا تھا۔''

''اچھا یوں کرو اپنے گاؤں جا کر دوسری شادی کرلو..... بچی کو یوں گلی گلی لے کر پھرنا ٹھیک نہیں۔''

''نہ جی گاؤں میں میرا کون ہے؟ وہاں تو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے۔ ماں باپ تو پہلے ہی رب کے پاس چلے گئے ہیں۔''

وہ میرے مفت کے مشوروں سے اکتا سا گیا تھا۔ اس کی اکتاہٹ کو دیکھتے ہوئے میں نے ایک درجن سموسے لے لیے۔

''دیکھو یوں کرو یہاں ہی کوئی لڑکی دیکھ کر دوسری شادی کرلو۔'' میں نے آخری مشورہ بھی دے ہی دیا۔

اس نے جواب دیئے بغیر تھال سر پر رکھ کر بچی کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھ گیا۔

سموسے خوب مرچ مصالحے والے تھے، تیل میں ڈوبے، لہٰذا مجھے پسند نہیں آئے۔ اس کی آواز کا مزہ زیادہ تھا۔ لیکن اب تو آواز آتی ہی نہ تھی۔ کتنے ہی دن گزر گئے۔

اس دن گلی محلے میں ایک سناٹا سا طاری تھا۔ رات ہی ہڑتال کی کال دی گئی تھی۔ آدھ درجن آدمی جان سے جا چکے تھے۔ چار بسیں اور ایک درجن گاڑیاں جلائی جا چکی تھیں۔ یہ تعداد رات کی تھی۔ دن میں کیا ہونا تھا کسی کو نہیں معلوم تھا۔ ایسے میں سناٹا نہ طاری ہوتا تو کیا ہوتا۔ بڑی چھوٹی سب سڑکیں ٹریفک سے خالی تھیں۔ گلیوں میں ہُو کا عالم تھا۔ آسیب کے سائے کی طرح..... نہ پھیری والوں کی صدا نہ بچوں کی چہک پہک.....

ایسے میں ایک آواز سی دور سے آئی جیسے کوئی ٹین کے ڈبے میں پتھر یا لوہے کے ٹکڑے ڈال کر زور زور سے بجائے۔ آواز گلی کے نکڑ سے آ رہی تھی۔ میں نے بالکونی سے جھانکا۔ وہیل چیئر پر ایک فقیر تھا جو ہاتھوں سے خود ہی اس کے پہیوں کو دھکیل کر چلا رہا تھا۔ ساتھ میں ایک بچی تھی یا بچہ دور سے پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میں اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔ بڑا بہادر فقیر ہے۔ ان حالات میں جبکہ آسیب اپنی گنتی پوری کرنے کے لئے چکراتا پھر رہا ہے۔ جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔ کیا اسے نہیں؟ میں نے سوچا۔

فقیر اپنے آپ کو دھکیلتا آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا

اب نظر آ رہا تھا کہ وہیل چیئر پر بیٹھنے کا سبب اس کی ٹانگیں تھیں جو گھٹنوں سے نیچے تھیں ہی نہیں۔ وہ اور قریب آیا..... اور قریب..... اور میں پہچان گئی۔ یہ تو وہی سموسے والا تھا۔ اور اس کے ساتھ چلنے والی اس کی بیٹی تھی۔ آدھا پاجاما اور بغیر بازو والی قمیض کے ساتھ جس سے اس کے جھلسے پاؤں اور بازو صاف نظر آ رہے تھے۔

ٹین کا ڈبہ بجاتی وہ جھلسی ہوئی بچی بے خوف تھی۔ سنسان آسیب زدہ سڑکوں اور گلیوں میں..... اب اسے کوئی خوف نہ تھا..... ہاں بھلا اسے اب کس بات کا خوف.....!!

☆☆☆

حفصہ افضال

پلّو میں گرہ

وہ ساکت وجود کیساتھ بولنے والی کا چہرہ دیکھے چلی جارہی تھی۔

''کیا یہ میرے رب کا حکم ہے۔'' سوکھے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے تصدیق کرنے کو پوچھا۔

حجاب میں موتی کی طرح چھپی ،سامنے بیٹھی لڑکی نے نچلا ہونٹ دانتوں سے کچلتے ہوئے خاموشی سے سر ہلایا۔سامنے پڑی کتاب کے صفحات مسلسل اڑتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔

دس لڑکیوں کے گروہ میں بیٹھے ساکت وجود نے سر پہ اوڑھے آنچل کا پلو اٹھایا تھا۔

گرہ باندھتے ہوئے اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔وہ اپنے نفس پہ ایک بھاری سل رکھنے جارہی تھی۔ جس کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ بوجھ کا احساس تھا جو اسے دبائے چلا جارہا تھا۔

بالآخر گرہ لگ گئی تھی۔متحرک انگلیاں ساکت ہوگئیں۔

اس نے نجانے کب سے رکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے سامنے بیٹھی ہم جماعت سے کہا۔

''میں نے انہیں اپنے پلّو سے باندھ لیا ہے۔'' دونوں ہاتھوں سے گرہ کے کنارے تھامے اس نے ایک جھٹکا دیا تھا گانٹھ پکی ہوگئی تھی۔

سامنے بیٹھی نوطالبات اسے ایک ٹک دیکھے چلی جارہی تھیں۔وہ واقعتاً ''مطیعہ'' تھی.....''مطیعۃ الرسولؐ''

☆.....☆.....☆

''جوتے نئے لواب.....''

''کیوں انہیں کیا ہوا؟'' تسمہ کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے تھے،اس نے حیرت سے سامنے بیٹھی سمیہ سے پوچھا تھا۔

''اتنے پرانے ہوگئے ہیں۔''

''کتنے پرانے ہوئے ہیں؟ابھی چھ ماہ پہلے ہی تو لیے تھے۔'' نیچے کو جھکتے ہوئے اس نے دوبارہ سے تسمہ کھولنا شروع کردیا تھا۔

''وہی تو بتانا چاہ رہی ہوں میں..... چھ ماہ ہوگئے ان کو.....ذرا شکل دیکھو رنگ اڑ گیا ہے ان کا.....''

اس نے غور سے جوتوں کی طرف دیکھا۔ براؤن کلر کے بند جوتے غور سے دیکھنے پر پرانے لگے۔کہیں کہیں سے رنگ اڑا ہوا بھی لگا۔ابھی صبح تو جب وہ انہیں صاف کررہی تھی تو وہ خوب چمک رہے تھے۔عیب نکالنے والی نگاہوں سے دیکھا تو عیبوں سے بھرے لگے۔

''بدل لوں گی۔'' جی ہی جی میں ارادہ کرتی وہ اٹھنے

لگی کہ گرہ لگا پلو لہرا کر سامنے آ گیا۔ اس نے ٹھٹھک کر پلو کو دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھوں سے گرہ کو جھٹکا دے کر مضبوط کیا۔

''جب تک یہ سلامت ہیں، انہی سے کام چل سکتا ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے رکی نہیں تھی۔

''ہاں لائف ٹائم گارنٹی کا کارڈ تمہیں ان کیساتھ ہی ملا تھا۔'' باہر جاتے ہوئے سمیہ کا جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا جسے اس نے خاموشی سے جھٹک دیا۔

☆.....☆.....☆

''میری calculus کی بک کہاں گئی ہے ادھر سے؟'' ایک دھاڑ تھی جو کمرے میں گونجی تھی۔

''ہمیں کیا پتہ۔'' مدیحہ نے سخت بیزاری کے عالم میں سمیہ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا، جواب بک ریک کو چھوڑ کر رائٹنگ ٹیبل سے کتابیں اٹھا پٹخ رہی تھی۔

''تو کسے پتہ ہوگا؟ تم لوگ ہی صفائی کرتے ہونا یہاں کی.....''

''صفائی کرتے ہیں اپیا، صفایا تو نہیں کرتے نا.....'' کوفت سے کہتے ہوئے مدیحہ بھی اٹھ کر اس کے ساتھ کتابیں الٹنے پلٹنے لگی، وہ جانتی تھی کہ کچھ ہی دیر میں اس کمرے کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا اور آخر میں کتاب کسی اور جگہ سے برآمد ہوگی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔

''یہاں..... یہاں اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر رکھی تھی میں نے بک.....'' اس نے ہاتھ میں پکڑی مکینکس کی کتاب زور سے سائیڈ ٹیبل پر پٹختے ہوئے کہا۔ جہاں اب فقط شیشے کا ایک گلاس موجود تھا۔ کتاب کا کونا گلاس سے ٹکرایا اور ایک زوردار چھناکے کی آواز پیدا ہوئی۔ سفید کانچ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ سمیہ نے صرف ایک پل کے لئے مڑ کر ٹوٹے ہوئے گلاس کو دیکھا اور پھر سے کتاب ڈھونڈنے میں لگ گئی۔

جہاں ہر ہفتے کسی نہ کسی چیز کا ٹوٹنا لازمی ٹھہرے وہاں ایسے چھناکوں کی آواز او رایسے کانچوں کا بکھرنا معمول کا حصہ بن جایا کرتا ہے۔

''کیا ہوا ہے؟'' مطیعۃ الرسول ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ سوالیہ نظریں سمیہ کی پشت کا طواف کرنے کے بعد مدیحہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ گو اس سوال کو اپنا جواب پہلے سے ہی کسی نہ کسی حد تک معلوم تھا۔

''تم نے ہی اٹھا کر رکھی ہوگی یقیناً کہیں..... یہ تمہیں ہی پڑی رہتی ہے ہر وقت ''لیر'' لیکر لگے رہنے کی.....'' اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ مطیعہ پر چڑھائی کر دی۔

''کیا گما ہے؟'' اب کے مطیعہ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے انتہائی سکون سے پوچھا۔

''Calculus کی بک نہیں مل رہی اپیا کی.....'' جواب مدیحہ کی طرف سے آیا تھا۔ قبل اس کے کہ سمیہ ترخ کر پھر کچھ کڑوا بول دے وہ جلدی سے بول اٹھی تھی۔

''اور ''اپیا'' کے اکیڈمی جانے کا ٹائم بھی ہو رہا ہے.....'' اس نے مدیحہ کے لہجے کی نقل اتارتے

ہوئے ایک دفعہ پھر انتہائی غصے سے کہا اور پھر سے چیزیں اٹھانے پٹخنے لگی۔ چند ہی منٹوں میں پورا کمرہ بکھر گیا تھا۔

''اپنے بیگ میں دیکھی ہے؟'' تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر کر اس کی کاروائی پہ ایک نظر ڈالتے ہوئے مطیعہ نے انتہائی اطمینان سے پوچھا۔

''میرے بیگ میں کہاں سے آجانی ہے، میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو یہاں بیٹھی پڑھ رہی تھی.....'' اس نے تیکھے لہجے میں لیکن ٹھٹھکتے ہوئے کہا۔

ہوسکتا ہے اس نے کتاب اٹھتے ہی بیگ میں رکھ دی ہو کہ ابھی تھوڑی دیر میں ہی تو اکیڈمی کے لئے نکلنا تھا، کمال ہے یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں.....

''ایک دفعہ دیکھو تو بیگ میں، ہوسکتا ہے.....'' مطیعہ کے الفاظ ابھی لبوں پہ ہی تھے کہ وہ گولی کی طرح اپنے بیگ کی طرف بڑھی۔ زپ کھولتے ہی سامنے ہی نیلے رنگ کی calculus کی کتاب موجود تھی۔ اس نے بے ساختہ کتاب باہر نکال کر سینے سے لگاتے ہوئے آنکھیں بند کرتے ہوئے سکون کا ایک لمبا سانس لیا۔ پھر احتیاط سے واپس بیگ میں ڈال کر زپ بند کردی اور بنا شرمندگی کی ایک ہلکی سی رمق کے بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا ٹھوڑی سے نیچے کیے نقاب سے پھر سے چہرے کو ڈھانپا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی

مدیحہ نے ناگواریت کے بھرپور احساس کے ساتھ اسے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ بے طرح جھنجھلا جانیوالی، غصے کی بے حد تیز..... ہمیشہ یونہی کرتی تھی، اپنی کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جاتی اور پھر گھر بھر سر پر اٹھا لیتی۔

اٹھنے سے پہلے بیڈ پہ چھوڑی اشفاق احمد کی ''زاویہ'' ایک دفعہ پھر سے اٹھا کر گھٹنوں پہ رکھتے ہوئے اور کھولتے کھولتے اس نے ایک غیر ارادی نظر اٹھائی اور گویا ٹھہر گئی۔ مطیعہ انتہائی سکون سے سمیہ کا پھیلایا بکھراوا سمیٹ رہی تھی۔

پہلے کیا یہ چیز حیران کرنے کو کم تھی کہ سمیہ کی تمام تر تلخ باتوں اور ہمیشہ کی طرح اس پر غلط الزام دھرنے کے باوجود مطیعہ خاموش رہی تھی، نہ صرف خاموش رہی تھی بلکہ انتہائی تحمل مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے درست سمت کی طرف اس کی رہنمائی بھی کی تھی اور اب اس کا پھیلایا سارا بکھراوا بھی سمیٹ رہی تھی۔

یاالٰہی..... !یہ کایا پلٹ..... حیرت سے دیکھتے اور سوچتے ہوئے اس نے گھٹنوں پہ دھری کتاب کھول لی جو اس سے باتیں کرنے کو بیتاب ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''امی آج خالہ کی طرف چلیں گے۔''

دال چنتی فہمیدہ بیگم ٹھٹھکی تھیں۔

''کس کی طرف؟'' انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا جیسے انہیں سننے میں غلطی لگی ہو۔ وہ مسکرادی۔

''خالہ کی طرف امی.....''

''یہ تمہیں آج خالہ کی یاد کہاں سے ستانے

لگی؟'' انہوں نے پھر سے دال چننی شروع کر دی۔

''یونہی امی، کافی دن ہو گئے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''یہ خیال تمہاری خالہ کو تو نہ آیا۔ انہیں تو بھانجیوں اور بہن کی یاد نہ آئی۔'' فہمیدہ بیگم کے لہجے میں واضح تلخی گھلی ہوئی تھی۔ دلوں میں دبے شکوے کبھی نہ کبھی زبان پہ آ ہی جایا کرتے ہیں۔

''تو کیا ہوا امی؟ اگر وہ ہم سے کٹیں گی تو کیا ہم بھی کٹ جائیں گے ان سے؟'' ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے نرمی سے پوچھا۔

''تم جانتی ہو جب سے تم نے حجاب کرنا شروع کیا ہے وہ تمہیں پسند نہیں کرتیں۔'' فہمیدہ بیگم نے واضح نظریں چرائیں۔ ان کی بات پہ وہ پھر سے مسکرا دی۔

''تو کیا ہوا؟ میں تو پسند کرتی ہوں نا انہیں..... میرے دل میں ان کے لئے کوئی میل نہیں.....''

''یہ آخر تمہیں آج بخار کیا چڑھ گیا ہے اپنی خالہ سے ملنے کا؟'' بالآخر وہ جھنجھلا گئیں۔

ان کی بات پہ وہ بالکل خاموش ہو کر نیچے کی طرف دیکھنے لگی۔

کافی دیر توقف کیا۔ پھر بولی تو یوں جیسے بھاری بوجھ تلے دبی جا رہی ہو۔

''حکم ہے امی..... کیا کروں، مجبور ہوں۔''

''شام کو چلیں گے پھر.....'' یہ کہتے ہوئے وہ ٹھہری نہیں تھی۔

فہمیدہ بیگم حیرت سے اسے اندر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''باجی دوالائچیاں بھی ڈال لیں چائے میں.....''

مدیحہ نے الائچیوں والی چھوٹی سی ڈبی اس کی طرف بڑھائی تھی۔

اس نے ڈبی تھامی، کھولی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے واپس رکھ دی۔

''تمہیں پتہ ہے نا مدیحہ! امی منع کرتی ہیں۔ انہوں نے کتنی دفعہ کہا کہ جب کوئی مہمان آئے صرف تب ہی چائے میں لائچی ڈالا کرو۔''

تو کیا ہوا باجی! امی کوئی دیکھ رہی ہیں۔'' مدیحہ نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''بی بنو! اللہ تو دیکھ رہا ہے نا۔'' وہ مسکراتے ہوئے گرم چائے کپوں میں انڈیلنے لگی۔

''یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے باجی..... کچھ دنوں سے آپ کتنا بدل گئی ہیں، نہ زیادہ بات کرتی ہیں، نہ سمیہ آپی سے غصہ ہوتی ہیں، کچھ دن پہلے آپ امی کے ساتھ خالہ کے ہاں بھی گئیں، حالانکہ سب جانتے ہیں، خالہ بھی نے کتنی زیادتی کی آپ کے ساتھ..... کتنا محاذ کھولے رکھا آپ کے خلاف.....''

''میں نے انہیں اس سب کے لئے معاف کر دیا۔'' اس نے پست لہجے میں کہا۔

''لیکن کیوں؟ یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔''

''میں حکم کی پابند ہوں مدیحہ۔ مجھ پہ نو باتوں کا بڑا بوجھ

ہے۔وہ مجھے اپنے بوجھ تلے دبائے ہوئے ہیں۔ نکلنے ہی نہیں دیتیں..... ہر جگہ، ہر موقع پر میرا پیچھا کرتی ہیں۔ مجھے آزاد چھوڑتی ہی نہیں.....وہ مجھے جکڑے ہوئے ہیں۔''

''کون سی نو باتیں باجی؟'' مدیحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''رسول ؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ میرے رب نے مجھے نو کاموں کا حکم دیا ہے۔

کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈروں

کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف غصے میں ہوں، دونوں حالتوں میں انصاف ہی کی بات کہوں

راستی واعتدال پر قائم رہوں چاہے امیر ہوں یا فقیر

جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں

جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں

جو مجھ سے زیادتی کرے میں اسے معاف کردوں

میری خاموشی غور وفکر کی خاموشی ہو

میری گفتگو ذکرِ الٰہی کی گفتگو ہو

میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو

میں نے ان نو باتوں کو پلو سے باندھ لیا ہے مدیحہ!'' اس نے سفید دوپٹے کا پلو پکڑے ایک گرہ لگائی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے پکڑے اسے ایک جھٹکا دیا۔

''یہ نو باتیں مجھے اپنے حصار سے نکلنے نہیں دیتیں۔''

سامنے کھڑی مدیحہ نے اپنی چادر کا کونہ تھاما اور ایک گرہ لگائی..... پکی، مضبوط گرہ.....

''آج سے میں نے بھی ان باتوں کو اپنے پلو سے باندھ لیا ہے باجی۔'' اس نے بھیگے لہجے میں کہا۔ مطیعہ کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔

اگر وہ مطیعۃ الرسول تھی تو سامنے کھڑی پیاری سی لڑکی مدیحۃ الرسول تھی۔

☆☆☆

فرحی نعیم

ملال

''حد ہوگئی بھئی، مجھے پتہ ہی نہیں چلا ..... کمال ہوگیا۔''سمیرا کے لہجے میں بڑا افسوس تھا۔

''ویسے باجی آپ کو کیوں نہ پتہ چل سکا؟''ثوبیہ بھابھی پوچھ رہی تھیں۔

''ارے ثوبیہ مجھے تو خود حیرت ہے۔ مین بازار میں لائن سے کئی دکانوں پر سیل لگی رہی اور میں بے خبر رہی۔حد تو یہ کہ ایک جگہ پچاس فیصد تک لوٹ سیل تھی۔''

''پچاس فیصد۔''بھابھی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''ہاں تو اور کیا پچاس فیصد، ارے یہ سارا قصور اس شبانہ کی بچی کا ہے، ذرا جو ہوا لگائی ہو خود ساری خریداری کر لی اور تینوں دن سیل کے ختم ہوگئے تو پھر بن کر پوچھ رہی ہے کہ سمیرا تم نے کیا کیا خریدا؟''میں معصوم، انجان، میں نے پوچھ لیا''کہاں سے''تو پھر بتایا میں تو یقین کرو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی، دل تو بڑا چاہ رہا تھا کہ کہوں اب بھی بتانے کی کیا ضرورت تھی لیکن روزے، رمضان کا خیال کر کے رہ گئی۔''سمیرا سخت غصہ میں تھی۔تیز تیز لہجے میں بولی۔

''تو آپ نے کچھ کہنا تھا۔''بھابھی نے ان کو اکسایا۔

''ارے بس، جب میں نے اس کا ذکر سہیل سے کیا نا تو وہ یہی بولے کہ اور تم اپنی اس پڑوسن کی طرفداری کرو، بڑا سر چڑھایا ہے تم نے اس کو، بس سمجھو میں تو بے خبری میں ہی ماری گئی۔سمیرا کے لہجے میں بڑا ملال تھا۔اور سمیرا کی چھوٹی بہن عائزہ یہ سب خاموشی سے سن رہی تھی اور دل ہی دل میں ان کی اس لایعنی گفتگو پر لاحول پڑھ رہی تھی۔ایک ذرا سے دنیا کے نقصان کا کتنا افسوس کر رہی تھیں دونوں۔سمیرا آج اپنی والدہ کے ہاں عید بعد فرصت سے آئی تھی۔رمضان میں تو ایسی مصروفیت رہتی تھی کہ بس آئی بھی تو تھوڑی دیر کے لئے یا پھر ایک دفعہ افطار کرنے۔پھر عید والے دن آئی دعوت پر، اب عید کے بعد جو فرصت ملی تو سوچا ماں، بہن اور بھابھی سے ملا جائے چنانچہ اب مل کے بیٹھے تو باتیں بھی ادھر ادھر کی شروع ہوگئیں اور خاص طور پر گزرے رمضان کی۔

''اور باجی آخری عشرہ کیسا گزرا؟ میں بھی گھر کی صفائی، ڈیکوریشن میں لگی رہی۔''بھابھی پوچھ رہی تھیں۔

''ارے آخری عشرے کی پوچھو ہی نہیں۔ اتنا

مصروف کہ بس.....''

''ہاں ظاہر ہے جاگنے والی راتیں ہوتی ہیں اور ہر رات کا اجر بھی بے حد و بے شمار ہے۔'' عائزہ بیچ میں بولی۔

''آں ہاں.....'' باجی چند لمحوں کے لئے اٹکیں۔اصل میں اپنی اور بچوں کی خریداری ہی میں سارا وقت گزر گیا ہر روز باہر کے چکر لگ رہے تھے۔کبھی کچھ رہ جاتا تو کبھی کچھ،لیکن عید کی تیاری ہے کہ پوری ہی نہیں ہو پاتی۔''

''تو باجی، رمضان سے پہلے ہی کیوں نہ خریداری مکمل کی تا کہ رمضان میں مکمل یکسوئی سے عبادت کی جاسکے۔اور پھر آخری عشرہ تو بڑا قیمتی ہوتا ہے دوزخ سے آزادی کا پروانہ ملتا ہے۔'' عائزہ افسوس سے بولی۔

''لو بھلا بتاؤ۔اصل ورائٹی تو عید کی آتی ہی رمضان میں ہے۔اب کیا بچوں کو اور میں خود پرانے ڈیزائن کی چیزیں خرید لیتی جو سب نے دیکھی ہوں اور تم کو میرے سسرال کا پتہ ہے نا ایک سے ایک اعلیٰ اور بڑھیا لباس، جوتے وغیرہ پہنے ہوتے ہیں سب نے عید پر۔'' وہ اترا کر بولیں۔

''لیکن باجی آخری عشرہ تو حصول ثواب اور جنت کا ہے نہ صرف دن بلکہ راتیں بھی اور آپ کو پتہ ہے کہ.....''

''ہاں بھئی میں کوئی جاہل نہیں تھوڑا بہت علم رکھتی ہوں۔'' وہ زور سے بولیں اور پھر ثوبیہ کی طرف متوجہ ہوکر دوبارہ سے اپنا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے اسی شوق سے بولیں۔

''میرے سسرال میں عیدی وغیرہ بھی تو جانی تھی جیٹھ کے بیٹے کی تو دوسری طرف نند کے ہاں بھی ایسا ہی سلسلہ تھا،تو اس طرح وہاں بھی تیاری، پیکنگ کے سلسلے میں جانا پڑا، پھر چوڑی مہندی بھی بھیجی تو جاگنے والی رات میں کہ اچھا رہے گا۔بس مردوں کے تراویح پڑھ کر آنے کے بعد جو ہم جاتے تھے تو رات کے ڈیڑھ، دو بج جاتے تھے بڑا مزہ آیا۔'' باجی کا سسرال نامہ کھل چکا تھا اور وہ بڑا لطف لے لے کر سنا رہی تھیں۔

''لیکن باجی یہ چوڑی مہندی تو رمضان سے پہلے بھی بھیجی جاسکتی تھی۔'' عائزہ پھر درمیان میں بولی۔

''ارے رمضان سے پہلے چوڑی مہندی کا کیا مزہ۔''

''اگر رمضان میں ہی رکھنی تھی تو روزے سے پہلے دے آتے وقت کی بربادی تو نہ ہوتی۔''

''ارے واہ!روزے میں جاتے سوکھے سوکھے؟'' سمیرا نے عائزہ کو ایسے دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

''یہ تو بہت قیمتی راتیں ہوتی ہیں۔کیا پتہ آئندہ نصیب ہوں یا نہیں۔'' عائزہ دھیرے سے بولی۔

''ہاں بھئی مجھے بھی معلوم ہے۔'' سمیرا قدرے بیزاری سے بولی۔

''آپ کو علم ہے کہ پچھلے ماہ بھی بہت بڑی لوٹ

سیل لگی رہی۔ عائزہ بولی۔

''ارے کہاں؟'' بھابھی اور باجی یک زبان ہوکر بولیں۔

''اللہ کے ہاں۔ اس نے اپنے بندوں کی رحمت ومغفرت کے لئے اپنے فرشتوں کے ذریعے بڑی آوازیں لگائیں۔ ہر نیکی پر کئی کئی گنا اجر دے رہا تھا۔ جنت کو سجایا گیا۔ خیر کے طالب کو بخشش دی جارہی تھی۔ اتنی بڑی سیل تو دنیا میں کہیں بھی نہیں لگتی جو ہم مسلمانوں کے لئے ہر سال اللہ لگاتے ہیں اور آخری عشرہ، اس سے زیادہ قیمتی تو دنیا میں کچھ نہیں آپ کو اس تو ملال کھایا جارہا ہے کہ آپ کو بازار میں لگی سیل کی خبر نہ ہوسکی لیکن اس کا ملال نہیں ہورہا کہ کیسی قیمتی گھڑیاں، کیسا انمول ماہ مبارک چلا گیا جس سے ہم اپنی کم علمی کی بنا پر فائدہ نہ اٹھا سکے۔'' عائزہ بولی تو بولتی چلی گئی۔ اس کی ان باتوں کے جواب میں وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔ یہ حقیقت تھی کہ رمضان کی آمد سے پہلے عائزہ انہیں استقبال رمضان کے ایک پروگرام میں بھی لیکر گئی تھی اور اس نے انہیں کتابچے بھی پڑھنے کو دیئے تھے لیکن ان کے پاس وقت کہاں تھا ان سب کے لئے۔

''آئندہ سال بھی رمضان آئے گا پھر.....'' بھابھی آہستہ سے بولیں۔ ''پھر ضرور.....''

''بشرطِ زندگی اور صحت۔'' عائزہ بات کاٹ کر بولی۔ ''کیا پتہ کہ ہمیں اگلا رمضان نصیب بھی ہوگا اور کیا معلوم کہ نصیب ہوگا تو ہماری صحت اور وقت وحالات کیسے ہوں، ہم اس کے شایانِ شان عبادت کر بھی سکیں گے یا نہیں۔'' اس کی بات کے جواب میں دونوں خاموش رہیں اور وہ توقف کرکے مزید بولی۔ ''بہرحال اب ہم کم از کم آئندہ کے لئے تو پلاننگ کرسکتے ہیں کہ آئندہ رمضان ہمیں کیسا گزارنا ہے۔ اپنی اصلاح احوال پر توجہ دیں گے۔ کیونکہ یہ روزے اللہ کے خاص مہمان ہوتے ہیں جو اپنے جلو میں ڈھیروں رحمتیں اور برکتیں لیکر آتے ہیں لہٰذا ان کی میزبانی کے لئے تو ہمیں خاص تیاری کرنی ہوگی۔ اس کے انعامات عارضی نہیں بلکہ مستقل ہیں۔ ہمیں ملال ہو تو اس کا کہ اللہ کی دی ہوئی اتنی بڑی پیش کش سے ہم فائدہ نہ اٹھا سکے، ایسا فائدہ جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تھا۔''

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو تم، ہم دنیا کے بکھیڑوں میں الجھے رہے اور خاص الخاص مہمان آکر چلے بھی گئے اور ہم ان کی صحیح طرح میزبانی سے محروم رہ گئے۔'' بھابھی بولیں، سمیرا نے بھی ان کی بات پر اثبات میں سر ہلایا۔ اب ان کے دل میں ایک نیا ملال گھیرا ڈال رہا تھا۔

☆☆☆

پہلا پاکستانی

فضا بہت بوجھل تھی۔ سمندر کا کنارہ، اگست کا مہینہ، اور فواروں کے نیچے نہاتے بچے جن کی معصوم آوازوں سے ماحول کا بوجھل پن خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ فواروں کے کنارے کھڑے والدین بچوں کی سرمستیوں کو دیکھ کر نہال ہو رہے تھے۔ شارجہ کی یہ خوب صورت تفریح گاہ ''قنات القصباء'' بچوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ فوارے یکدم بند ہو جانے سے بچے حیران سے ہو جاتے اور پھر غیر متوقع دوبارہ پانی کی دھاریں بچوں کو اچھلنے کودنے پر مجبور کر دیتیں۔

مائیں تھک کر قریب کے بنچوں پر بیٹھ جاتیں اور باپ بچوں کی نگرانی کو فواروں کے گرد کھڑے رہتے۔ بچے کسی طور پانی کے کھیل سے دستبردار نہ ہوتے۔

''محاسن کو آپ دیکھتے رہئے گا'' نرمین نے تھک کر قریبی بنچ پر بیٹھنے کی غرض سے جگہ کو جانچتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔

فواروں کے سامنے ایک دائرے میں بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے ایک کنارے پر وہ بھی ٹک گئی۔ ساتھ ہی دو خواتین اور بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ لباس اور بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں انڈیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی باتوں کی آواز تو آ رہی تھی مگر کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا نہ ہی اس نے سمجھنے کی کوشش کی۔ بھلا اسے ضرورت بھی کیا تھی کسی کی باتوں پر توجہ دینے کی۔

اتنے میں ایک چند سال کے بچے کی انگلی پکڑے ایک صاحب ان کی طرف آئے اور دونوں سے مخاطب ہوئے:

''شمع! بڑی مشکل سے فاطمہ کو پانی سے کھینچ کر لایا ہوں۔ اس کے کپڑے بدلا کر آؤ۔''

اور ان میں سے ایک خاتون بچی کا ہاتھ پکڑ کر اس جگہ کی طرف چلی گئیں جہاں بچوں کے لباس خشک کرتے اور بدلائے جاتے ہیں۔

''بھائی! کل 14 اگست ہے۔ جلدی گھر چلیں۔ ہمیشہ کی طرح ابا جان کی فرمائشیں پوری کرنا ہوں گی۔''

''جی ہاں! جلدی گھر جانا چاہیے۔'' چونکہ یہ گفتگو قدرے بلند آواز میں تھی لہٰذا نرمین چونک گئی میرا خیال تھا یہ انڈین ہیں مگر..... 14 اگست کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟

ہوسکتا ہے پاکستانی ہوں.....مگر.....اتنے میں ایک اور صاحب موبائل پکڑے ان کی طرف آئے وہ فون پر بات بھی کرتے آ رہے تھے۔

''جی.....جی ہمیں یاد ہے۔آپا، آپ فکر مت کیجیے۔ ہم ابا جان کی خواہش اور 14 اگست کا خیال رکھیں گے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے موبائل فاطمہ کے والد کو پکڑایا۔''آپا کا دہلی سے فون ہے''۔شش و پنج میں مبتلا تھی کہ یہ کیا چکر ہے۔14 اگست، ابا جان، دہلی سے آپا کا فون۔

اتنے میں شمع فاطمہ کو لے کر واپس آئیں نرمین نے سوچا ان سے سلام دعا کرتی ہوں۔لیکن وہ لوگ تو پہلے ہی جلدی میں تھے۔اور وہ اس کے ذہن میں سوالات کے جوابات کی بھول بھلیاں چھوڑ گئے.....ایک عجیب سی الجھن تھی۔دو تین لفظوں اور جملوں میں اتنا تضاد تھا کہ کوئی کسی کے ساتھ نہ جچتا تھا نہ فٹ بیٹھتا تھا۔''محاسن! محاسن!''نرمین نے چارے سالہ بیٹی کو آواز دی۔مگر پانی کے شور بچوں کی آوازوں میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔

''فواد! جلدی گھر چلیئے۔''نرمین نے فواد کے بازو کو سختی سے پکڑا۔

''کیوں؟ بھی محاسن کھیل رہی ہے کھیلنے دو۔''

''پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ اگر جلدی سے میں ان لوگوں کے پیچھے جاؤں تو شاید بات کرنے کا موقع مل جائے۔ ہوسکتا ہے وہ ادھر قریب ہی رہتے ہوں۔''اس نے سوچا اور خود کلامی کی۔

''فواد! محاسن کو لایئے۔''نرمین نے کچھ ضدی سے لہجہ میں کہا۔

''تمہیں ہوا کیا ہے؟''لو اب بھلا میں فواد کو بتادوں تو پتہ نہیں کیسے کیسے القابات سننے کو ملیں گے۔وہ تو ہر بات میں مجھے مذاق کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔''کچھ نہیں۔چلیں جیسے آپ کی مرضی۔''اس نے ہتھیار ڈال دیئے کہ اب کیا فائدہ۔خوامخواہ بدمزگی ہوگی فواد سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔

جب محاسن خود تھک کر چور ہوگئی تو وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے جو کہ قریب ہی تھا۔''نور ٹاور'' کی لفٹ میں داخل ہوتے وقت اس نے سوچا شاید وہ لوگ کہیں دوبارہ مل جائیں۔بچی کو لے کر دوبارہ کبھی ادھر ہی آئیں۔

''فواد! کل 14 اگست ہے۔یہاں تو پتہ ہی نہیں چلتا، اپنے ملک میں یوم آزادی منانے کا مزہ ہی اور ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے،مگر چھٹی تو ہم یہاں کے قومی دن کی بھی منا ہی لیتے ہیں۔''گویا قومی دن کا مقصد صرف چھٹی منانا ہوتا ہے۔نرمین نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس کے دل میں اتنی کھلبلی سی مچی ہوئی تھی اور ذہن کی سکرین پر انڈین لوگ''14 اگست'' اور''ابا جان کی فرمائشیں'' کی پٹی چل رہی تھی..... جب وہ لفٹ سے نکل کر اپنے فلیٹ میں پہنچے تو محاسن اپنی پرام میں سو چکی تھی۔

اگلی صبح ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اس نے سب سے پہلا کام ٹی۔وی کھولنے کا کیا.....سارے پاکستانی چینل، یوم آزادی کے حوالے سے اپنی عقل وفہم کے مطابق قوم کا شعور بیدار کر رہے تھے کچھ نیا نہیں تھا۔

نہ پروگرام، نہ پیغام۔ نہ ہی کسی چینل کو دیکھنے میں دل لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن کی سکرین پر تو بریکنگ نیوز وہی پٹی چل رہی تھی جس کی رات کو ابتدا ہوئی تھی۔

14 اگست کی شام کو ایسوسی ایشن نے مشاعرے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ وہاں سبھی ملنے جلنے والے جمع تھے۔ مشاعرے کی کشش سے زیادہ محض اپنوں کو ایک ساتھ جمع دیکھنے کی خواہش زیادہ کام کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ اپنی دوست شفق کے انتظار نے اسے بہت بور کیا۔ جب وہ ہال میں اندر آتی دکھائی دی تو تقریب ختم ہونے کو تھی۔

''جب کھانے پینے کا وقت ہوا تو محترمہ تشریف لائی ہیں۔''

نرمین نے چھوٹتے ہی گلہ کیا۔

''بہن آج ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا آنے کو، صرف تمہاری خاطر آئی ہوں۔''

''بڑی مہربانی ہے آپ کی، ویسے کیا ہوا ہے تمہیں؟'' دوستانہ بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

ضروری تو نہیں کہ طبیعت اُچاٹ ہونے کے لیے کچھ ہونا ضروری ہو۔'' اس نے بھی نرمین کا کہا ہوا جملہ دہرایا۔

''اچھا! ہماری بلی ہمیں کو میاؤں.....'' چلو چھوڑو، بتاؤ کیا پیو گی؟ ٹھنڈا یا گرم اور گرم میں چائے، قہوہ یا کافی..... دیکھو، سب انتظام ہے۔ شفق کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ لپک کر دو ڈرنک لے آئی۔ ساتھ پلیٹ میں کچھ نمکین اور میٹھا۔

ہال کے ایک کونے میں دونوں ٹک گئیں۔ شفق کا سات سال کا بیٹا اپنے سکول کے دوستوں میں کھیل کود رہا تھا۔ محاسن کو اپنے باپ کے ساتھ رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ان کی انگلی پکڑے کھڑی تھی۔ اس وقت کافی بے فکری سی محسوس ہو رہی تھی جبکہ شفق خاموش سی تھی۔

''طبیعت ٹھیک ہے؟ سر میں درد رہا ہوگا، نیند نہیں آئی ہوگی۔ ناصر بھائی نے کچھ کہہ دیا کیا؟'' اس نے ایک ساتھ بہت سارے سوال اس کے سامنے ڈال دیئے۔

''کچھ نہیں ہے ایسا.....'' شفق نے دوست کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجھے بتاؤ! یہ پاکستان کی کیا خدمت ہو رہی ہے۔ سب جو یہاں آئے ہوئے ہیں ان کے آنے سے پاکستان کو یا قوم کو کیا فائدہ ہوا؟'' وہ سخت جھنجھلائی ہوئی لگ رہی تھی۔ نرمین بھول گئی تھی کہ وہ ہمیشہ ہی ایسی تقریبات میں دل گرفتہ سی بیٹھی رہتی تھی۔ اس نے بھی ہمیشہ کی طرح جواب دیا۔

''یوم آزادی کی خوشی میں میل ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہنس بول لیتے ہیں پردیس میں کوئی اور کیا کر سکتا ہے؟''

''بس رہنے دو'' وہ بیزار سی منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

''تمہارے اس طرح منہ پھلا کر بیٹھنے سے قوم کی کیا خدمت ہو رہی ہے؟'' نرمین نے بھی جواباً تیر پھینکا۔

شفق! سارا سال تمہیں یاد نہیں آتا۔ تم بھی تو اس ایک دن اپنے ''قومی جذبات'' کا رونا رونے بیٹھ جاتی

ہو۔تم نے پاکستان یا قوم کے لیے کیا کیا؟

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو'' میں بھی تو اس قوم کا حصہ ہوں۔ گلے شکوے، دوسروں پر اعتراضات اور رونا دھونا بھی اس قوم کا شعار بن گیا ہے۔'' وہ خود سے ہم کلام لگ رہی تھی۔

''اگلے سال قومی دن پر کوئی خدمت کی پیش رفت ہو گی یا پھر دوسروں کو خوش دیکھ کر دل میں تنگی اور بے زاری برقرار رہے گی۔''

اس نے شفق کو نارمل موڈ میں لانے کی کوشش کی۔

''اگر تم اگلے سال اپنا موڈ ٹھیک رکھ کر تشریف لاؤ تو کم از کم ایک پاکستانی میں تبدیلی آ جائے گی'' اور وہ کچھ کہے بغیر ڈرنک کی طرف متوجہ ہو گئی۔

لوگ آہستہ آہستہ واپس جانے لگے۔ ناصر اور فواد بھی باتوں میں مگن تھے۔ محاسن تھک کر اپنی پرام میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ شفق کا بیٹا یوسف آئس کریم سے نبرد آزما تھا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ ملازم تقریب کے بعد والے ''مناظر'' کو نظروں سے ہٹانے کا اہتمام کر رہے تھے۔ غیر ذمہ داری سے پھینکے ہوئے گلاس، ٹشو پیپر، پلیٹیں، بے ترتیب کرسیاں۔

''یہ سب کچھ ایک مہذب معاشرہ کو زیب نہیں دیتا'' نرمین نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ مگر بولی کچھ نہیں۔

شفق بھی ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو ایک دوسرے کو کہنے کے لیے ایک ہی بات تھی۔ اس لیے مسکرا کر تائید کر دی۔

اتنے میں ملازم صفائی کرتا ان کے قریب آیا تا کہ وہ دونوں خالی ٹن اور پلیٹیں اس کے ہاتھ میں پکڑے کوڑے دان میں ڈال دیں۔

دبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ شفق کو ان لوگوں سے بڑی ہمدردی رہتی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''عبدل'' اس کا لہجہ بنگالی تھا۔

وہ کسی امید پر کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ شفق پرس کھولتی نظر آ رہی تھی۔ دو سکے اس کے ہاتھ پہ رکھ دیئے وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

''دیکھ لو! پاکستانی ملازم نہیں مل سکتا تھا ان کو؟ یہ تو حال ہے۔''

''اچھا! اچھا، چھوڑو تم ان باتوں سے خوامخواہ اپنا موڈ خراب کرتی ہو۔''

نرمین نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا کیونکہ فواد ادھر ہی آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے ناصر اپنے بیٹے کو آوازیں دیتے نظر آئے تو شفق بھی اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔

''کیسی رہی تقریب آپ کے خیال میں'' نرمین نے پوچھا۔

''ہمیشہ کی طرح ہی تھی۔ بس ایک نئی بات یہ لگی کہ کچھ انڈین دوست بھی بلائے ہوئے تھے'' فواد نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''انڈین دوست؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''امن کی آشا'' چل رہی ہے نا! ویسے بھی کیا حرج

ہے ایک دوسرے کی تقریبات میں جانے سے۔''

اور وہ بات جو کل رات اُسے بے چین کیے دیتے تھی آج صبح ذہن سے نکل گئی تھی۔ اس وقت یاد آ گئی۔ انڈین فیملی، 14 اگست اور ابا جان۔

نرمین نے ساری بات فواد کو بتائی تو انہوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ''لو بھلا، 14 اگست کا مطلب صرف پاکستان کا یوم آزادی تو نہیں ہے اس تاریخ کو لوگوں کے گھروں میں اور بھی کوئی خاص واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔''

''لوگ پیدا ہو سکتے ہیں، لوگ مر سکتے ہیں، شادیاں کر سکتے ہیں'' فواد نے مڑ کر بیوی کو دیکھا اور استہزائیہ انداز اور لہجہ نے نرمین کو آزردہ کر دیا۔

''اس میں مذاق اڑانے والی کون سی بات ہے؟ ان کو تو بہانہ چاہیے ہوتا ہے بس پتہ نہیں کیوں میں نے ان سے ذکر کر دیا۔ اور کیوں خود ہی اس بات کی طرف میرا دھیان نہیں گیا۔'' وہ بہت روہانسی ہو رہی تھی۔

فواد نے اس دن دفتر جانے سے پہلے نرمین کو یاد دہانی کرائی کہ وہ پراپرٹی ایجنٹس سے رابطہ کر کے کسی فلیٹ کے بارے میں معلومات کرے۔ ان کے فلیٹ کے کرائے کی معیاد ختم ہو رہی تھی اور وہ کسی دوسری جگہ شفٹ ہونا چاہ رہے تھے، جہاں سے ٹریفک میں پھنسے بغیر دوبئ جایا جا سکے کیونکہ فواد کو روزانہ دو چکر دوبئ کے لگانے پڑتے تھے اور بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دوبئ، شارجہ کے بارڈر پہ ایک بلڈنگ میں فلیٹ دیکھنے کے لیے شام کو جانا طے ہوا۔ پراپرٹی ایجنٹ تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ بلڈنگ کا چوکیدار کسی کام سے گیا ہوا ہے وہ آئے گا تو فلیٹ کی چابی مل سکتی ہے مگر فواد کو بہت جلدی تھی۔

''اگر آپ ساتھ والے فلیٹ کو ایک نظر دکھا دیں تو اندازہ ہو جائے گا۔''

نرمین کو بھی یہ بات پسند آئی کہ اس طرح کمروں کی سیٹنگ کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیسے لگ رہا ہے فرنیچر اور سامان۔

''جی، ہو سکتا ہے'' پراپرٹی ایجنٹ کو خود بھی شاید کوئی جلدی تھی۔

فلیٹ کا دروازہ کھلتے ہی نرمین چونک گئی۔ بے اختیار بولی:

''شمع! آپ!'' اس کے سامنے فوراً قناۃ القصباء کا منظر گھوم گیا۔ جواباً شمع کی حیران و پریشان صورت اور شوہر کے متوقع ردعمل سے وہ جھینپ سی گئی۔ وہ چودہ اگست والی بات کا تو منطقی انجام ہو چکا تھا۔ خیر، زبان کی کمان سے لفظوں کا تیر نکل چکا تھا۔ اور اب نرمین محجوب تھی کہ شمع کو کیا بتائے کہ وہ اس کو کیسے جانتی ہے؟ یہ شکر ہے کہ شمع نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ لی اور فلیٹ دیکھ کر وہ اپنے گھر واپس آ گئے۔

اگلا ہفتہ بھی مزید گھر دیکھنے میں گذرا لیکن حسب حال وہی فلیٹ لگا جو شمع کی بلڈنگ میں تھا۔ اور دس بارہ روز کے بعد نرمین اس فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔ کچھ دن گھر

کی سیٹنگ میں گذرے اور پھر وہ محاسن کی انگلی پکڑے گفٹ پیک لئے شمع کے دروازے پر پہنچ گئی۔ کچھ محجوب سی نرمین نے جھجکتے ہوئے دروازے کی گھنٹی بجائی، جانے وہ کیسا محسوس کریں۔

ہلکی سی کٹ پٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ شمع اپنی بیٹی فاطمہ کو ساتھ لیے کھڑی تھی۔

''آیئے، آیئے'' سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے خوش دلی سے نرمین کو اندر آنے کی دعوت دی۔ فلیٹ میں پاپ کارن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹی۔ وی پر ٹام اینڈ جیری کارٹون چل رہے تھے۔ ہلکی پھلکی معمول کی گفتگو کے بعد دونوں طرف کچھ حجاب ختم ہوا تو بے تکلفی کا ماحول بن گیا۔ شمع کو جیسے یک دم یاد آ گیا۔

''آپ نے مجھے دیکھتے ہی کیسے پہچانا؟ مجھے تو یاد نہیں پڑتا ہماری کبھی ملاقات ہوئی ہو شاید۔''

نرمین نے ساری بات بے تکلفی سے بتا دی تو شمع ہنسنے لگی۔

''ہاں! ہمارے چچا جان یعنی ہمارے سسر کی تاریخ پیدائش بھی 14 اگست ہے''۔

''اچھا، اچھا'' نرمین بھی ہنسنے لگی۔ اور اس کے دل میں تھوڑا سا جو سسپنس تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

فاطمہ اور محاسن کارٹون دیکھنے میں مگن تھیں۔ اور ساتھ پاپ کارن کھا رہی تھیں۔

''میں سمجھی کوئی ایسی خاص بات ہے جو پاکستان کے قومی دن اور انکل کے ساتھ وابستہ ہے۔''

''وہ بھی ہے'' شمع نے نرمین کے ہاتھ میں ڈرنک پکڑاتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟'' نرمین بے تاب سی ہو گئی۔

''یہی کہ دونوں ایک ہی دن وجود میں آئے۔''

دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''چچا جان شاید آپ لوگوں سے زیادہ خود کو پاکستانی سمجھتے ہیں۔'' شمع نے اطلاع فراہم کی۔

''وہ کیسے؟''

''کبھی ہمارے چچا جان سے مل کر خود ہی پوچھ لیجیے گا۔ پاکستان کے بارے میں ان کا جو فلسفہ ہے، وہ شاید آپ لوگوں کو بھی نہ پتہ ہو۔''

''کیا واقعی ایسا ہے؟'' نرمین کے لہجہ میں استعجاب تھا۔

''واقعی۔'' شمع نے حتمی انداز میں کہا۔

''اب کہاں ہیں چچا جان؟''

''آرام کر رہے ہیں۔''

''اچھا میں اب چلتی ہوں۔'' نرمین نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ میں آپ کے بارے میں چچا جان کو بتاؤں گی۔ وہ یقیناً آپ سے ملنا پسند کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، آپ بھی آیئے نا! ہماری طرف۔''

''جی، انشاء اللہ'' دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے فون نمبرز کا تبادلہ کیا۔

محاسن کو سکول داخل کرانے کے لیے میاں بیوی معلومات اکٹھی کر رہے تھے اور سکولوں کے دورے بھی کر رہے تھے۔ روزانہ ہی کہیں نہ کہیں جانا ہو جاتا اور واپس آ کر گھر کے کام کاج میں وقت گذر جاتا۔ یونہی کئی دن گذر گئے۔ ایک دن نرمین نے فواد سے پوچھا:

''شام کو چلیں چچا جان سے ملنے۔''

''کون چچا جان؟''

''وہی جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا کہ وہ پاکستان کے بارے میں کچھ خاص نظریات رکھتے ہیں۔''

''اچھا، اچھا! کبھی کھانے پر بلا لیتے ہیں ان کو.....'' فواد نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی۔ وی چینل تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے میں شمع سے بات کر کے کوئی وقت طے کر لیتی ہوں۔'' نرمین ذرا پر جوش سی ہو گئی۔

آئندہ جمعہ کی رات کے کھانے پر سب نرمین کے گھر جمع تھے۔ چچا جان بہت ضعیف دھان پان سی شخصیت تھے۔ بڑے سائز کا کالا چشمہ ان کی شخصیت کو نمایاں کر رہا تھا اگر چہ رات کے وقت ان کا کالا چشمہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ مگر ان کی ''سفید چھڑی'' ان کے کالے چشمے کی وجہ بتا رہی تھی۔

کھانے کے دوران سب کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ نرمین کو بہت اچھا لگا۔ شمع نے اس کے ساتھ بہت تعاون کیا اور منع کرنے کے باوجود سویٹ ڈش بھی بنا لائی۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔

''بھئی ہماری بیگم تو آپ سے بہت متاثر ہے''۔ فواد نے چچا جان کو مخاطب کیا۔ شمع ہنستے ہوئے بولی۔ ''جی، ہاں۔ اُس دن سے جب ہمیں خبر بھی نہ تھی کہ کوئی ہم سے متاثر ہو کر ہمارا پیچھا بھی کر رہا ہے۔'' سب اس بات سے محظوظ ہوئے۔ ''متاثر ہونے کی وجہ 14 اگست کا ذکر تھا۔'' نرمین کو بہت بے قراری تھی کہ وہ چچا جان کی زبانی کچھ سنے۔

''ارے کیا یاد کرا دیا؟'' چچا جان نے پہلو بدلا اور اندازے سے خالی فنجان میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

''نرمین کو پاکستان کے بارے میں بزرگوں کی یادداشت سننے کا بہت شوق ہے۔ آپ کو جو کچھ یاد ہے ضرور بتائیے پلیز۔'' فواد نے بیوی کے دل کی بات کر دی۔

''آج تو میں بہت تھک گیا ہوں اور میرے سونے کا وقت بھی نکلا جا رہا ہے۔ اگر وقت پہ بستر پر نہ جاؤں تو پھر نیند نہیں آتی۔''

''جی، آپ درست فرما رہے ہیں۔'' فواد نے ان کی تائید کی۔

''ہم کسی اور دن آپ کے ساتھ خصوصی نشست رکھ لیں گے۔'' نرمین نے شوہر کی بات کو آگے بڑھایا۔

''ٹھیک ہے! اب اجازت دیجیے۔'' اور یوں آج کی ملاقات بھی ادھوری رہ گئی۔ ان کے جانے کے بعد نرمین نے کچن سمیٹا اور سونے چلی گئی۔

اگلے دن شفق کا فون آیا تو نرمین نے ساری کارروائی اس کے گوش گذار کی۔

''اگر ہم کچھ اور لوگوں کو بھی اس ملاقات کے لیے بلا لیں خصوصاً جوانوں کو، تو کیسا رہے گا؟'' شفق کی اس تجویز سے نرمین کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

فواد سے نرمین نے مشورہ طلب کیا تو وہ بولا'' ذرا سمجھدار بچوں کو ہی بلا لیتے ہیں صرف.....''

''ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔'' نرمین نے یہ کہہ کر اپنے جاننے والوں کے بچوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔شفق اور نرمین کی کوششوں سے اگلے ہفتہ کو دس سے پندرہ سولہ سال کے چار چھ لڑکے راضی ہو ہی گئے۔دس بارہ سال کی دو تین لڑکیاں بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ آ جائیں گی۔

اس دن نرمین بے حد مصروف تھی۔صوفوں کے ساتھ اضافی کرسیاں لگا کر جگہ بنائی گئی۔کچھ کھانے پینے کا انتظام کیا۔اور مغرب کی نماز کے بعد چچا جان کو لے کر فواد آ گئے۔سب بچوں نے اپنا تعارف کروایا اور محفل جم گئی۔

''میرا نام سید صالح محمود ہے۔'' بچوں نے کالے چشمے والے ان بوڑھے شخص کو کہتے سنا۔

''میں 14 اگست کو پیدا ہوا تھا۔'' بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ آئی۔

''جب پاکستان بنا تو اس 14 اگست کو میں دس سال کا تھا۔'' سید صاحب نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ کو سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں زیادہ دیر بیٹھنے اور لمبی بات کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔بس کچھ ضروری باتیں کر لیتے ہیں۔''

''آپ سب پاکستانی ہیں، آپ بہت خوش قسمت ہیں۔'' تھوڑے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

''میرے ایک سوال کا صحیح جواب جو بھی دے گا اس کو سودرہم انعام ملے گا۔'' سودرہم ملنے کی توقع پہ سب کے کان کھڑے ہو گئے اور بچوں میں تھوڑا جوش پیدا ہو گیا۔

''کیا سوال ہے؟ بتائیے۔'' سب سے بڑی عمر کے بچے نے اعتماد سے پوچھا۔

''سب سے پہلا پاکستانی کون تھا؟'' سید صاحب نے پوچھا۔

''قائداعظم!'' ایک آواز آئی۔

''کہہ سکتے ہیں مگر یہ وہ جواب نہیں جو مجھے پتہ ہے۔'' سید صاحب نے آہستہ سے کہا۔

''علامہ اقبال کیونکہ انہوں نے ہی پاکستان بننے کی تجویز دی تھی۔'' ایک ہوشیار بچے نے کہا۔''ہوسکتا ہے آپ کا جواب درست ہو مگر میرے جواب سے آپ کا جواب نہیں ملتا۔''

فواد اور نرمین نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، اس سوال میں ان کو بھی گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔فواد کو یک دم یاد آیا اور اس نے سید صاحب سے اس کھیل میں شامل ہونے کی اجازت مانگی۔

'ہاں ضرور' اجازت ملنے پر فواد نے بڑے اعتماد سے

کہا کہ ''علامہ محمد اسد روڈ ٹو مکہ والے.....وہ خاص طور پر پاکستان آئے، یہاں کے آئین کے لیے کام کیا اور سعودی فرماں روا کی پیشکش تھی کہ وہ سعودی عرب کا پاسپورٹ حاصل کریں۔مگر انہوں نے پاکستانی بننا پسند کیا۔''

فواد تیز تیز بول کر اپنی معلومات کو اگل رہا تھا گویا اُس کا جواب سو فیصد درست مانا جائے گا۔

''اچھا یہ بھی ٹھیک بات ہوسکتی ہے۔مگر جو میں جانتا ہوں وہ یہ نہیں ہے۔''

سید صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنا چہرہ فواد کی آواز کی طرف گھما کر کہا۔

''پاکستانی کہلانا واقعی بہت خوش قسمتی تھی نا اسی لیے تو انہوں نے اس کا انتخاب کیا تھا۔''

نرمین بھی حیران سی سید صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ بچے سوچوں میں گم تھے،فواد نے سید صاحب کی بات پہ اقرار میں سر ہلایا پھر اسے خیال آیا کہ بول کر اپنی بات سید صاحب کو پہنچانی چاہیے۔''جی آپ درست فرماتے ہیں۔ پاکستانی کہلانا خوش قسمتی سمجھی جاتی ہوگی مگر اب تو 'پاکی' کا مطلب.....''اور خاموش ہوگیا۔

دکھ اور افسوس اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ چھوٹے بچے تو آپس میں باتیں کرنے لگے، ان کو اس موضوع میں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہ ہو رہی تھی۔فواد، نرمین اور دو تین بڑے بچے سید صاحب کے سوال کا جواب کھوج رہے تھے۔ اپنے اپنے انداز میں ہر کوئی ذہن پہ زور دے رہا تھا۔کمرے میں بچوں کی آوازیں تیز ہونے لگیں، نرمین نے چھوٹے بچوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔''آپ پاکستان کو صرف ان لوگوں کا ملک نہ سمجھیں جو پاکستانی پاسپورٹ رکھتے ہیں، میں بھی پاکستانی ہوں' ہر مسلمان پاکستانی ہے، وہ ایک مرکز بنایا گیا، امت مسلمہ کی امامت کے لیے۔اسلام کا قلعہ۔ مظلوم مسلمانوں کی پناہ گاہ۔ مدینہ کی طرز پہ ایک خالص اسلامی ریاست۔ سارے مسلمانوں کے دکھوں کا مداوا جہاں ہو۔''

''جی، مقصد تو یہی تھا پاکستان بنانے کا۔'' فواد نے جواب دیا۔

''بدلا تو نہیں مگر وہ رہا بھی نہیں۔'' فواد نے سوچا سید صاحب کی اگر آنکھیں کام کرتی ہوتیں تو ان سے نظریں ملانا کتنا مشکل ہوتا۔

''نہیں بدل سکتا کوئی..... یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام خاص ہے۔ جو ستائیس رمضان المبارک کی لیلۃ القدر کو نازل ہوا۔ جیسے قرآن اللہ کا کلام شب قدر کو نازل ہوا۔قرآن پاک کی حفاظت اللہ کے ذمہ ہے۔ پاکستان کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔اگر اس کو اور قرآن پاک کو لام وملزوم کر دیا جائے تو کس کی مجال ہے کہ اس کی طرف بری نگاہ بھی ڈالے؟''

عشاء کی اذان ہونے لگی تو سب خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد سید صاحب نے وضاحت کرنا شروع کی۔

''دیکھو! پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ.....تو

جس کا اس کلمہ پہ یقین اور ایمان ہے وہ پاکستانی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مدینہ بھی دراصل ''پاکستان'' ہی بنایا گیا تھا۔ پاک جگہ توحید کو ماننے والوں کی جگہ۔ طابہ اور طیبہ کے بھی تو وہی معنی ہیں جو پاکستان کے ہیں۔ اسی طیبہ کا تسلسل ہے یہ ملک پاکستان.....''

ابھی ان کی بات جاری تھی کہ ان کو لینے کے لیے شمع اور اس کا شوہر آ گئے بچوں کے والدین نے بھی فون کرنے شروع کر دیئے تھے۔ سید صاحب کو سب نے دوبارہ ملنے کا وعدہ لے کر رخصت کیا۔ اس لیے کہ ابھی 100 درہم ملنے کی امید باقی تھی۔ ایک ایک کر کے بچے بھی چلے گئے نرمین نے فواد کو سوچوں میں گم دیکھا تو پوچھا:

''پہلا پاکستانی تلاش کر رہے ہیں کیا؟''

''ہاں سوچ رہا ہوں کہ ان کی باتوں میں کتنی گہرائی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ مگر فواد! اب پاکستانی خود کو پاکستانی کہلانا پسند نہیں کرتے۔ ماں باپ خود اپنی اولادوں کو پاکستان سے باہر جا کر بس جانے کا اصرار کرنے لگے ہیں۔ ہر کوئی پاکستان سے بھاگنا چاہتا ہے اور سید صاحب کہتے ہیں کہ سارے مسلمان ''پاکستانی'' ہیں اور پاکستانی کہلانا خوش قسمتی ہے۔'' فواد نے سوچتی آنکھوں سے نرمین کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلانا کافی سمجھا۔

نرمین نے یہ سب شفق کے گوش گذار کیا تو وہ بھی اگلی محفل میں شامل ہونے کو بے تاب ہو گئی۔ سید صاحب کی سوچ نے سب کو ایک نئی امنگ عطا کر دی تھی۔ فواد نیٹ پہ کچھ تلاش کرتا رہتا۔ نرمین بھی مختلف سائیٹس پر پرانے اخبار و رسالے پڑھتی اور نوٹس لیتی نظر آتی اور اب ادھر شفق بھی ''پہلے پاکستانی'' کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی فکر میں رہتی۔

ایک دن محفل میں شریک عثمان کا فون آیا۔

''آنٹی! میں نے بوجھ لیا ہے سید صاحب کے سوال کا جواب۔ اب ہم کب آئیں؟''

نرمین نے خوشی کا اظہار کیا بچے کو شاباش دی اور جلدی اطلاع دینے کا وعدہ کیا۔ اسی دن وہ شمع سے ملنے چلی گئی تا کہ سید صاحب سے ملاقات کا وقت لے سکے۔ ان کی طبیعت کافی ناساز تھی، اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے، شمع کو پیغام دے کر وہ چلی آئی۔ شام کو فواد دفتر سے گھر آئے تو نرمین نے سید صاحب کی ناسازی طبیعت کا بتایا۔

''میں ان کے پاس تھوڑی دیر میں جاتا ہوں۔'' فواد کو بھی تشویش ہونے لگی۔

سید صاحب سے ملاقات کر کے فواد گھر آیا تو کافی سنجیدہ اور فکرمند نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے کیسی طبیعت ہے ان کی اب؟'' نرمین نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بہتر ہے۔'' فواد نے خود کلامی سی کی۔

''آپ اتنے خاموش کیوں ہیں؟'' نرمین فواد کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''نرمین! میں بے حد دکھی ہو رہا ہوں۔ تمہیں پتہ ہے سید صاحب کی آنکھیں نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' بے اعتبار سے لہجہ میں اس نے شوہر سے سوال کیا۔

میں جب گیا ان کے پاس تو ان کا بیٹا ان کو وضو کروا رہا تھا۔ اس لیے کالا چشمہ اتارا ہوا تھا۔ نرمین! وہاں چشمہ کے نیچے بینائی کے بغیر آنکھیں نہیں دو گہرے گڑھے تھے۔ اُف! تم تصور نہیں کر سکتی ایسا دیکھنا کس قدر تکلیف دہ تھا۔ فواد کی آواز بھر آئی ہوئی تھی۔

نرمین کے دل کو بھی بہت ٹھیس پہنچی۔ ''فواد! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ نے پوچھا نہیں کہ یہ کیسے ہوا؟''

''نہیں، بھلا کوئی کیسے پوچھ سکتا ہے؟''

''ہاں یہ تو ہے، کیسے پوچھا جا سکتا ہے؟'' نرمین نے شوہر کی بات کو دہرایا۔

فواد کے لئے رات گئے تک وہ دو آنکھیں سوالیہ نشان بنی رہیں۔ بینائی نہ ہونا تو اللہ تعالیٰ کی مرضی..... مگر ایسا تو نہیں کبھی سنا دیکھا کہ.....ضرور کوئی حادثہ گذرا ہے ان کے ساتھ.....فواد دیر تک اس منظر کو نہ بھلا سکا۔

اگلے دن پہلی فرصت میں نرمین نے شمع کو فون کیا۔

''کیسی طبیعت ہے سید صاحب کی؟''

''آج تو الحمد للہ کافی بہتر ہے۔'' شمع نے جواب دیا۔ ''اگر آپ نے ان کے ساتھ ملاقات رکھنی ہو تو ان سے بات کر لوں؟''

''جمعرات کی شام ٹھیک رہے گی۔ ایک دو بچے بھی پوچھ رہے تھے انہوں نے ہی کہا تھا اس دن کا.....'' نرمین نے بتایا۔

''اچھا۔ ٹھیک ہے میں چچا جان سے پوچھ کر حتمی بات جو ہوگی بتا دوں گی۔''

یوں جمعرات کو شفق بھی آ گئی۔ عثمان ہی آیا اور کوئی بچہ نہ آ سکا۔ وہ بے حد مشتاق لگ رہا تھا۔ سو درہم جیتنے کا اُسے قوی یقین تھا۔ نرمین نے اسے چھیڑا کہ مجھے بھی بتا دو ہم پچاس پچاس درہم لے لیں گے۔ مگر وہ بھی ایک کائیاں نکلا اور بتا کر نہ دیا۔

تھوڑی دیر میں سید صاحب کو ان کے بیٹے فواد کے گھر چھوڑ گئے۔

مغرب کے بعد سب صوفوں پر ٹک گئے۔ فواد بھی خاص طور پر مختلف جگہوں سے معلومات لے کر تیاری کے ساتھ بیٹھا تھا، لیپ ٹاپ سامنے کھول کر۔

کالے چشمے کو دیکھ کر فواد اور نرمین نے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے کوئی مشترکہ دکھ شیئر کر رہے ہوں۔

عثمان بہت بے تاب تھا..... ''انکل میں بتاؤں آپ کے سوال کا جواب کیا ہے؟''

''کیا سب تیاری کر کے آئے ہیں؟'' سید صاحب سب سے مخاطب ہوئے۔

شفق نے بتایا کہ میں نے بھی کوشش تو کی ہے ''پہلے پاکستانی'' کے بارے میں معلومات لینے کی۔

''فواد میاں، آپ کے پاس کیا ہے؟''

''میں نے آپ کی باتوں ک روشنی میں کافی کچھ

تلاش کیا ہے۔ آپ کی باتوں کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔'' فواد نے مؤدب ہوکر کہا۔ ''ٹھیک ہے، سب کو میں نے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا نا!'' سید صاحب اپنی کامیابی پہ خوش نظر آرہے تھے۔

''انکل! میں بتاؤں۔'' عثمان مارے جوش کے کھڑا ہی ہوگیا۔

''ہاں! بتایئے.....'' چوہدری رحمت علی نے پاکستان کا نام تجویز کیا تھا وہ ہی ہیں پہلے پاکستانی.....'' وہ بولا ''ہوسکتا ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں۔'' سید صاحب نے جواب دیا۔

شفق بولی ''ہوسکتا ہے میرا جواب درست ہو۔''

''جی! آپ بولیے۔'' سید صاحب نے یہ کہا اور پھر ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''پہلے ہم دیکھیں فواد میاں کے پاس کیا معلومات ہیں؟''

''میں نے ''پاکستان کیوں بنایا گیا؟'' کے تحت کافی کچھ تحقیق کی ہے اور میں نے یہ جانا کہ پاکستان کوئی زمین کا ایک ٹکڑا نہیں اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ کی کچھ خاص نسبت ہے۔'' اس نے لیپ ٹاپ پہ پاکستان کے لیے کچھ لنک نکال رکھے تھے۔ ''فیوچر آف پاکستان''، ''تشکیل پاکستان کی روحانی بشارتیں'' جن میں ریاست مدینہ سے پاکستان کی مماثلت کے اہم پہلو اجاگر کئے گئے تھے۔ بہت سے اخبارات و رسائل کے کالم جس میں بے حد اہم انکشافات شامل تھے۔ جس کا مختصر سا تعارف اُس نے سب کے سامنے رکھا اور بتایا کہ میں نے یہ سارے لنکس اپنے سارے دوستوں کو بھیجے ہیں۔ فیس بک پر اور ہر جگہ ان باتوں اور ان حقیقتوں کو پھیلانے کی اشد ضرورت ہے۔ نرمین بہت دیر سے خاموش تھی۔ اس نے بھی کچھ کہنے کی اجازت لی۔

''مجھے اتنی حیرت ہوئی کچھ باتوں کو جان کر کہ قائداعظم اور علامہ اقبال دونوں کو ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پاکستان بنانے کا فریضہ سونپا گیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، ظفر احمد عثمانیؒ، شبیر احمد عثمانیؒ کے علاوہ اور بہت سے جید علماء اور اولیاء اللہ نے گواہی دی کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی منشاء سے پاکستان بنوایا اور سب سے زیادہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی نگرانی اور منشاء کے مطابق اس کا انتظام فرمایا۔ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ یہ اسی پاک و طیب شہر نبی ﷺ کا تسلسل ہے۔ یہ سب میں نے میگزین ''العارفین'' میں پڑھا ہے۔'' نرمین ایک سانس میں یہ سب کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''جی! آپ درست کہہ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے، اس کا ہاتھ ہے اس پر آپ کو معلوم ہے پاکستان 1366ھ میں آزاد ہوا تھا۔ اس زمانے میں روایت تھی کہ تاریخ پیدائش اور نام کی علم الاعداد سے مناسبت نکالا کرتے تھے۔ تو 1366ھ کی تاریخ سے جو جملہ مناسبت رکھتا ہے وہ کیا ہے؟''

''کیا ہے؟'' نرمین کو ایسی باتوں سے بہت دلچسپی

تھی۔عثمان بے چارہ اب خاموش اپنے سو درہم کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

سید صاحب نے ٹھہر ٹھہر کر کہا ''محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ'' اس کے ساتھ 1366ھ کی مناسبت بنتی ہے۔اعداد کے لحاظ سے۔

اور 1947ء کے ساتھ جو آیت مناسبت رکھتی ہے وہ بھی سننے کے لائق ہے کہ..... وانّالہٗ لحٰفظون (الحجر)۔

''واہ! سبحان اللہ!'' شفق بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر سید صاحب کو یاد آیا کہ اس کی بات درمیان میں رکوائی گئی تھی۔''جی آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔''

''ہاں! میں نے غور کیا کہ قائداعظم نے کہا تھا:

''پاکستان اسی دن بن گیا تھا، جب ہندوستان میں پہلا آدمی مسلمان ہوا تھا تو اس لحاظ سے وہ پہلا پاکستانی تھا جو ہندوستان میں سب سے پہلے مسلمان ہوا۔''

شفق کی بات میں بہت وزن تھا۔سب اس کو داد بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔''سب نے اپنی اپنی معلومات کے مطابق جواب دیئے ہیں۔مگر سو درہم کوئی نہیں جیت سکا۔''سید صاحب کی مسکراہٹ گہری ہوگئی ''مگر آپ پریشان نہ ہوں سو درہم آپ سب پر ہی خرچے جائیں گے۔ جواب آپ سب کے درست ہو سکتے ہیں لیکن یہاں جواب وہ درست تسلیم کرنے کی بات ہوئی تھی جو میرے جواب سے مطابقت رکھتا ہو۔ بہرحال میری طرف سے سب کو آئس کریم کی دعوت پکی ہے۔''

''مگر آپ بتایئے تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟'' فواد درمیان میں ہی بولا۔سید صاحب توقف کے بعد بولے:

''پاکستان محمد علی جناح نے نہیں بنایا۔وہ تو منتخب کیے گئے۔کام کے لیے ان کو چنا گیا۔اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی منشا تھی کہ یہ آدمی ان کے کام میں تعاون کرے ان کی خواہش اور منشا کو پور کرے۔ ان کو محمد رسول اللہ ﷺ نے خود ہمت بندھائی۔حوصلہ دیا، اٹھایا اور کام سونپا۔تو جس نے کام سونپا ہو دراصل تو وہ کام اسی کا ہوتا ہے۔وہ چیز اسی کی ہوتی ہے وہی اس کا مالک ہوتا ہے۔ اس پاکستان کے لیے بہت قربانیاں دی گئیں، جان، مال، عزت آبرو.....ہجرت کی کٹھن راہیں بھی گواہ ہیں.....''سید صاحب کی آواز میں نمی آنے لگی۔

ایک آہ سی ان کے سینے سے نکلی.....'' میں ان آنکھوں سے اس عظیم اسلامی ریاست کو دیکھنے کی کتنی تمنا رکھتا تھا جس کی بنیادوں میں کلمہ شہادت تھا۔مگر میری یہ دو آنکھیں..... خیر! آنکھیں چھین لینے سے بصیرت کو کوئی نہیں چھین سکتا۔''

سید صاحب نے اپنے کالے چشمے پر ہاتھ رکھ دیئے۔فواد اور نرمین ہمہ تن گوش ہو گئے۔آنکھیں ہوتی تھیں ان کی.....دونوں نے ایک ہی بات سوچی۔ادھر سید صاحب کو اپنی آنکھوں میں ابھی بھی تیزاب کی جلن محسوس ہونے لگی۔

''حوض کوثر پہ میں ''پہلے پاکستانی'' کے حضور گذارش کروں گا: آقا ﷺ! آپ ﷺ کے پاکستان کے لیے میں کچھ نہیں کر سکا۔ اس کو صرف اپنی دو آنکھوں کا نذرانہ پیش کر سکا ہوں۔''

کمرے میں ایک ہی احساس اجاگر تھا۔

''ہمارے پاس کیا ہے پیش کرنے کو؟''

☆☆☆

میری لائبریری سے

نام کتاب: ''سہارا''
مصنفہ: بنت الاسلام
پبلشر: ادارہ بتول
ملنے کا پتہ: سید پلازہ 0 3 فیروز پور روڈ لاہور 04237585449

(معذرت خواہ ہوں کہ گزشتہ سے پیوستہ کالم میں کتاب ''چراغوں کا دھواں'' کے ملنے کا پتہ نہیں لکھا جاسکتا، قارئین نوٹ فرما لیں۔ 267 نزد سٹیٹ لائف بلڈنگ۔صدر روڈ راولپنڈی)

جی جناب! قلم کی قسم رب ذوالجلال نے کھائی اور ساتھ ہی دوسری قسم ''سطور'' میں لکھی چیز کی۔ اور کیا خوب قسم کھائی کہ وہ کام جو تیر و تفنگ نہیں کر سکتے وہ قلم کر جاتا ہے اور کچھ قلمکار ایسے ہوتے ہیں جو قلم کے استعمال میں ''آل راؤنڈر'' ہوتے ہیں۔ نظم، نثر، مقالے، افسانے، ناول سب کو لے کر چلتے ہیں اور شاہکار تخلیق کرتے ہیں۔ان کے قلم سے نکلے الفاظ خواہ ناول میں ہوں یا افسانے میں اصلاح کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ذکر ہے۔ یہ مومنات کیسی ہوتی ہیں، وہ کون سے کام ہوتے ہیں جو ان کے ایمان کو درجہ کمال تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی کے جن جن مراحل پر ہم آنکھیں بند کر کے فیصلے کر رہے ہوتے ہیں وہ مومنہ عورتیں اپنے سامنے ''ایمان'' کو کیسے رکھتی ہیں یہ سب قصے کہانیوں سے پتہ چلتا ہے۔اسی لئے قرآن میں یوسفؑ کا قصہ مکمل بھی ہے اور پوری جذئیات کے ساتھ بھی۔

میرے سامنے آج ایسی ہی مومنہ عورت کے کردار پر مبنی ایک ناول ہے جو میرے لڑکپن کی یادوں میں سے ایک بیش قیمت سنہری یاد ہے۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور میسرہ، زبیدہ مامی، اخلاق صاحب کے کردار کو پڑھتے اور سوچتے گزر جاتی تھیں اگر یہ یاد کروں کہ اس زمانے میں یہ ناول میں نے کتنی دفعہ پڑھا تھا تو انگلیاں کم پڑ جائیں اور تعداد زیادہ ہو جائے۔ بہرحال آیئے آج کے ناول ''سہارا'' کی طرف چلتے ہیں۔

اے ابر نو بہار، نہ دکھلا برس برس
گھر آئے میرا پیا گیا جی ترس ترس

اور

جواب خط نہیں دیتے یہ کیا عادت تمہاری ہے
میرے دل کے سٹیشن پر غموں کی ریل جاری ہے

پتہ چلتا ہے گنگنانے والی ہستی منیرہ کی ممانی

زبیدہ کی ہے جو سامنے والے گھر میں مقیم ہیں اور میاں کی دل لگی کے سامان گھر کی بجائے باہر ہیں ان کی یاد میں گنگنا کر غموں کا اظہار کر رہی ہیں۔

زبیدہ مامی ناول کا ایسا کردار ہیں جو منیرہ پر دل وجان سے قربان ہے اور اس کے لئے جو کچھ بھی وہ کرسکتی ہیں کرتی ہیں۔منیرہ کا بچپن انہی زبیدہ مامی سے کٹنی کی کہانی سنتے گزر جاتا ہے۔

میکے آمد پر منیرہ کو نہ کوئی شاپنگ کرنا ہے نہ ہوٹلنگ، کام ہے تو بس یہ کہ جتنے بھی عزیز واقارب، سہیلیاں ہیں ان سے ملاقات کرنا ہے اور قیام کی اجازت صرف پندرہ دنوں کی ملی ہے اس قلیل مدت میں ملنے والیوں کی ایک لمبی فہرست ہے ۔اس شش وپنج میں کہ پہلے کس سے ملا جائے۔محترمہ بنت الاسلام کی تحریری خوبی واضح ہوتی ہے۔لڑکی کا تربیتی پہلو جو ایک منٹ کے لئے بھی اوجھل نہ ہو۔باتوں باتوں میں ایک اچھی ماں (صالحہ بیگم) کیسے سکھاتی ہیں!!

''بیٹی! اس سارے جم غفیر سے ملنا کس وقت ہے؟ میرا خیال ہے ان سب کو ملنے کے لئے کم از کم چودہ پندرہ چاہئیں، آخر ایک ایک دو دو گھنٹے تو سب کے پاس بیٹھو گی اب یہ چودہ ردن اگر تم نے انہیں لوگوں سے ملنے میں ختم کر دیئے تو پھر ہمارے پاس کب بیٹھو گی؟''

''آخر یہ طے ہوا کہ روزانہ صرف نو سے بارہ بجے تک جس جس سے ملا جا سکے مل لیا جائے اس کے بعد گھر پر ہی رہا جائے۔''

''پہلے قریبی رشتہ داروں سے ملو پھر کہیں اور جانا ایسے نہ ہو کہ انہیں پتہ چلے کہ تم لاہور آ کر دوستوں سے ملتی رہی کرو اور ان تک نہیں پہنچی۔''

قارئین! پورے ناول میں بچیوں کی تربیت کے کئی کئی پیراگراف میں انداز ناصحانہ نہیں مشفقانہ ہے لہٰذا یہ ڈائیلاگ دل میں جگہ بنا لیتے ہیں۔رشتہ داروں سے ملتے ملاتے چار یا پانچ دن گزر گئے۔ان کے بعد منیرہ سب سے پہلے اپنی استاد اصغری خانم ے ملنا چاہتی ہے۔

قارئین! اصغری خانم کا کردار ''ایمانی طاقت اور استقامت سے بھرپور ہے۔سرتاپا آزمائشوں میں گھری ایسی عورت جو ہر آزمائش پر مسکراتے ہوئے پوری اترتی ہے۔انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ مشاورت کا خواہاں اور دکھ سکھ کرنے کے لئے کندھا تلاش کرتا ہے۔اس کو سامنے رکھا جائے تو منیرہ کو صراط مستقیم پر چلنے اور چلتے رہنے کے لئے اصغری خانم کا کردار بہت جاندار ہے۔نہ آزمائشوں پر گلے شکوے نہ بے صبری، گھر میں ویرانی نہ بچوں پر اس کے اثرات۔یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خاوند کی بے توجہی، مالی مشکلات، اکلوتے جوان بھائی کی موت، اپنے بچے کی وفات کم سن بیٹی کی آنکھوں کی تکلیف میں بھی ایک عورت حوصلہ مند رہے؟اس کا جواب پڑھیے۔

''ان کو مصائب کا ہی نام دیا جائے گا لیکن میرے گھر میں تمہیں ان کے اثرات اس لئے نہیں دکھائی دیتے کہ میں نے ان مصائب کے آگے ہار نہیں مانی۔ اور ہار نہ ماننے کا سرچشمہ ایک ہی ہے بیٹی۔جس سے

قوت حاصل کی جاتی ہے میں نے اس کو مضبوطی سے تھام لیا تو میرا دل و دماغ اور جسم کا ایک ایک عضو قوت سے بھر گیا۔ اگر میاں میرے بچوں کے اخراجات کا ذمہ نہیں لیتا تو پھر کیا ہے، رازق تو درحقیقت کوئی اور ہے اور اصلی رازق نے اگر مجھے اس انسان کے ذریعہ نہیں دیا تو وہ کسی اور ذریعہ سے دے رہا ہے وہ مجھے دے تو رہا ہے اگر میرا شوہر رات رات بھر گھر نہ آئے تو میں تنہا تھوڑی رہتی ہوں وہ رحیم و کریم مالک تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتا ہے اگر میرا بھائی خدا نے واپس بلا لیا تو میرے لئے جزع فزع کا کوئی جواز نہیں میری دو بہنیں میرے دکھ سکھ کی ساتھی تو موجود ہیں اگر مالک نے میرا ایک بچہ لے لیا تو اس کی مہربانی سے چار موجود ہیں اگر میرے ایک بچے کو دمہ ہو گیا ہے تو دل شکستی کی کوئی بات نہیں میرے چار اس بلا سے محفوظ ہیں اگر میری بچی کی نظر کمزور ہے تو میں غم والم کا شکار کیوں ہوں اس کی عام صحت خدا کی مہربانی سے بہت اچھی ہے، میں جتنا بھی غور کروں مجھے زندگی میں دکھ کی بہ نسبت سکھ زیادہ نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے ہار نہیں مانی۔''

قارئین! یہ پیراگراف نہیں سوچ کا ایسا زاویہ تھا کہ اس کو اپنانے سے الحمدللہ ہم بہت مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کر سکتے ہیں اور اصغری خانم کی دانش سے بھرپور باتوں کا سلسلہ اگلے صفحات میں بھی موجود ہے۔

ناول کا اہم کردار ماجد ہے۔ منیرہ کا شوہر بے پناہ خوبصورت، اپنے آپ کو گلفام سمجھنے والا، معیار بندگی کی بجائے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوششوں میں مگن۔ بیوی بچوں پہ جان چھڑکنے والا۔ پندرہ دن کی بجائے جب وہ آٹھویں دن منیرہ کو لینے آتا ہے تو گھر کے مکینوں پر سوگ طاری ہو جاتا ہے، ٹرین کے ذریعہ منیرہ اپنے گھر جاتی ہے تو ٹرین کے سفر کا آنکھوں دیکھا حال بہت دلچسپ ہے۔ طرح طرح کے مسافر، اس سے بھی مختلف انسانی رویے کہ سفر میں ایک ایسا کردار سامنے آتا ہے جو ہر لحاظ سے ''غیر معمولی'' ہے ایک بوڑھی خاتون جو انتہائی رعب و دبدبہ کی مالک ہیں، سب کو کمتر اپنے آپ کو برتر سمجھتی ہیں، انگریزی فرفر بولنے کی وجہ سے انہیں انگریزی بولنے والی کا خطاب ملتا ہے۔ کتاب کے کئی صفحات ان کے ذکر سے بھرے ہیں۔ سفر کے اختتام پر ڈاکو کا زنانہ ڈبے پر حملہ اور انگریزی بولنے والی کا اس سے مردانہ وار مقابلہ کرنا (پورے ڈبے کی خواتین کو کیسے یک جہتی میں پروتا ہے یہ ناول منگوا کر پڑھیے)

ناول کا اگلا باب منیرہ کی سسرال صوفی نیاز علی کے گھرانے کے ماضی اور حال کے تعارف پر مشتمل ہے۔ خاندان کس طرح کے افراد پر مشتمل ہے، ہر فرد کا تعارف الگ الگ دیا گیا ہے۔ صوفی نیاز کی بیوی بیٹے، بہوئیں اور پانچویں بچے ''ماجد'' (جسے آگے چل کر منیرہ کا شوہر بننا ہے) کا تعارف چند لفظوں میں۔

''ماں باپ کے برعکس ماجد میں سوجھ بوجھ زیادہ تھی، باوجود کم عمری کے اپنی مفلوک الحالی کا گھاؤ اس

کے سینے میں اتنا گہرا تھا کہ اس کی تمام کوششوں اورمحنتوں کا مرکز ومحور ایک ہی چیز تھی اور وہ یہ کہ اپنے بہن بھائیوں کواس معراج تک پہنچا سکے کہ اہل خاندان جنہوں نے صوفی کے بچوں کو دودھ کی مکھی کی طرح خاندان سے نکال کر باہر پھینک دیا تھا نہ صرف یہ کہ انہیں دوبارہ خاندان میں داخل کرنے پر مجبور ہوجائیں بلکہ ان کے ساتھ تعلق رکھنے پر فخر محسوس کریں۔

منیرہ کی سسرال کا اچھا کردار، منیرہ کی جٹھانی عابدہ کا ہے، صالح فطرت خاتون جو خاندان کے لئے قربانیاں دے دے کر دلوں میں جگہ بناتی ہے۔ ماجد اپنی چرب زبانی سے کس طرح اخلاق صاحب تک پہنچتا ہے ان کی نظروں میں اپنا مقام بناتا ہے، منیرہ سے رشتہ کے لئے اسے کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں یہ سب تو ناول ہاتھ میں لے کر پتہ چلے گا البتہ سیشن جج ماجد کی بیوی بن کر منیرہ کے دل پر کیا بیتتی ہے یہ ذکر کیے بغیر آگے گزرنا ناممکن ہے۔

جس گھر میں منیرہ کی رہائش تھی وہ وسیع اور خوبصورت کوٹھی تھی جو شہر کے فیشن ایبل علاقے میں واقع تھی۔ اردگرد ویسی ہی خوبصورت اور وسیع وعریض کوٹھیاں تھیں۔ ان کوٹھیوں کے مالک رشوت خور افسر یا چور بازاری کرنے والے بڑے بڑے تاجر تھے، ان گھروں کی خواتین کے لئے زندگی میں کام کم اور آرام زیادہ تھا مگر وہ آرام کی بجائے آوارہ گردی کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ یہ محترم خواتین اس گروہ سے تعلق رکھتی تھیں جن کے بارے میں ابوتمیم فرید آبادی یوں رقمطراز ہیں ''پھر پکڑتا ہے شیطان عورتوں کو اور بنا دیتا ہے انہیں بے شرم۔ وہ جاتی ہیں ساتھ شوہروں اپنوں کے ہر جگہ اور جب ایک ڈینگ مارتے ہیں شوہر ان کے تو مارتی ہیں وہ ڈبل ڈینگ۔''

پیارے قارئین! منیرہ ان ڈینگوں سے دور رہتی ہے، گھبراتی ہے اور جب شہر کے رئیس خاندان کا عیاش لڑکا قتل کے الزام میں پکڑا جاتا ہے۔ ماجد کا جوش دیانت داری ابھی نیا نیا اور بڑی کمزور حالت میں تھا، اس وقت ماجد کا کزن اور اس کی بیوی چرب زبانی سے اسی ہزار کے لالچ میں قاتل کو چھڑوانے کے لئے قائل کر لیتے ہیں۔ اسی ہزار کے حصول کی دلدل میں ماجد ایسے دھنس جاتا ہے کہ ہر آنے والا دن قسمتوں کی سیاہی پھیرنے کا باعث بنتا ہے۔ ایسے میں منیرہ کا کردار ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنے والی عورت کا ہے، چیخ چلا کر مطالبہ منوانے والی یا دلائل سے قائل کرنے والی عورت کا؟ یہ سب پڑھے سے تعلق رکھتا ہے حرام کمائی سے ماجد کا سٹیٹس بھی بلند ہوگیا، ٹوٹے خاندان سے ناطہ جڑنے میں ٹرین کے سفر میں ملنے والی انگریزی بولنے والی عورت کا کردار شامل ہے۔ ان کی ''انٹری'' اس شاندار طریقے سے ہوتی ہے کہ پھر یہ کردار بہت آگے بڑھتا ہے اپنے جلو میں خاندان کے افراد کا ماڈریٹ طور طریقہ۔

خوب صورت گیٹ اپ، عمدہ کاغذ کے ساتھ یہ ناول بہت فرمائشوں کے بعد چھپ کر آیا ہے، دیر آید

درست آید کا مقولہ سچ ثابت کرنے کے لئے۔

ناول کی مرکزی کردار منیرہ ہے۔اللہ امت مسلمہ کی ہر بچی کو وہ شعور اور فہم عطا کرے جو منیرہ کو تھا۔ایسی سادہ مزاج لیکن مضبوط کردار کی مالک کہ اقبال کا ''مردِ مومن'' بھی دنگ رہ جائے۔ یہ ہے کہ حیا، عصمت وعفت کا مفہوم سمجھنے والیاں، رزق حلال کو درخور اعتنا نہیں سمجھتیں حالانکہ کیا نبی اور کیا ولی رزق حلا ل سب کے اعمال کی قبولیت کا دارومدار ہوتا ہے۔حرام رزق کا ایک لقمہ عبادت کو غیر مقبول اور انسان کو جہنم کا لقمہ بنادیتا ہے۔ آج مرد رزق حلال کی ضرورت اور اہمیت نہیں سمجھتے، مسائل میں گھری عورت کیسے سمجھ سکتی ہے لیکن آفرین ہے منیرہ کے کردار پر جو ازدواجی زندگی کے پہلے دن سے اسی حلال رزق کو اپنا مشن بنالیتی ہے اور بالآخر میاں کو حرام رزق سے بچالیتی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب اس کالم کے لئے میں نے سہارا کا انتخاب کیا تو میری بچیاں خوشی سے بولیں ''امی یہ ناول ہم نے بھی پڑھا ہوا ہے بہت اچھا ناول ہے۔اس کا مطلب ہے کہ کم ازکم اس معاملہ میں ماں اور بچیوں کی ایک رائے ہے۔

آیئے علامتی اور خوب صورت ٹائٹل والے ناول سہارا کی چند جھلکیاں پڑھتے ہیں۔

ناول کا آغاز منیرہ کی میکہ آمد اور وہاں کے فیملی ممبرز کے تعارف سے ہوتا ہے۔منیرہ ایک شریف النفس ، وضعدار لیکن حلال رزق کمانے والے اخلاق حسین صاحب کی بیٹی ہے جس کی بہنیں شائستہ، ارجمند اور رافیہ ہیں تینوں غیر شادی شدہ ہیں۔ماں کا نام صالحہ بیگم ہے جو مجموعہ ہائے صفات کی مالکہ ہیں۔ میکے کی پہلی رات منیرہ کے لئے بڑی خوشگوار ہے۔سونے کے ارادے سے چھت پر جاتی ہے اور کانوں میں کسی کے گنگنانے کی آواز آتی ہے۔

اپنی دلی خواہش یعنی دنیا کی ہر آسائش میرے پاس ہو، رشتہ داروں میں میری دولت کا عب دبدبہ ہو، کے باجود ماجد کا ''دل ویران'' ہے دولت آئی تو ان رشتہ داروں نے بھی منہ ماجد کی طرف کرلیا۔ پارٹیاں فنکشنز کے باوجود ماجد کھویا کھویا رہتا ہے۔کتاب کے اختتام میں ماجد کی ایک رشتہ دار کسی انگریز ملک سے آکر ماجد کو اخلاقی دلدل میں گھسیٹنا چاہتی ہے۔کس طرح عابدہ اس قصے کو ختم کراتی ہے۔

منیرہ کی دونوں بہنوں اور بھائیوں کی شادی میں ماجد کیوں شریک نہیں ہوسکتا۔شادی کے دوسرے دن اپنی گرفتاری سے پہلے وہ منیرہ کو خط میں کیا لکھتا ہے کن رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔منیرہ کے باپ اور ماں کے مرنے کے بعد اس پر اور اس کے بچوں پر کیا بیتتی ہے۔دولت کا انبار دیکھ کر سسرالی رشتہ داروں سے جڑا تعلق کس طرح ٹوٹتا ہے۔کون اس کڑے وقت میں چھپر چھاؤں بنتا ہے اور کون تپتی دھوپ۔یہ سب کتاب میں موجود ہے۔ البتہ حلال رزق کے لے تگ ودو

کرنے والی منیرہ ستر آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ماجد کی رہائی کے بعد جو کردار ادا کرتی ہے یہ کتاب کا خوبصورت باب ہے۔ بالخصوص آخری باب میں سادہ طرز زندگی، فطرت سے قریب ماحول اور اس کے بچے بہت مزہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول میں ہلکا پھلکا مزاح، کہیں کہیں غضب کے مکالمے، کہانی در کہانی کے تانے بانے اور آخر میں اپنے مسائل کے حل ہو جانے پر بے فکری کی بجائے وطن اور مذہب کی محبت اور ان دونوں کے مصائب پر دل کا کڑھنا بہت مؤثر ہے۔

منیرہ کی مستقل مزاجی اور ہمت کو سلام کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن اس کے لئے صفحات کا دامن تنگ ہے سو اگلے ماہ تک کے لئے بشرط زندگی اجازت۔

فی امان اللہ

☆☆☆

اجنبی مسافر

میں اور میرے شوہر ڈاکٹر آصف اپنے بیٹے ہادی کی دوسری سالگرہ سے قبل اس کے لئے تحائف خرید نے کی غرض سے بازار گئے۔ میں نے ہادی کے لئے بال ہاؤس اور کھلونا ٹیلیفون خریدا جبکہ آصف نے ہادی کی سالگرہ کے فوراً بعد ہادی کو تحفے میں کسی تفریحی مقام کی سیر کرانے کا عندیہ دیا۔

ہم نے بلیک پول کے تفریحی مقامات کی بہت تعریف سن رکھی تھی۔ چنانچہ ہادی کی سالگرہ کے تین روز بعد یکم جون بروز ہفتہ بلیک پول جانے کا ارادہ کیا۔

بلیک پول (Black Pool)

بلیک پول انگلینڈ کے شمال مشرقی علاقے میں واقع خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کی آبادی کم وبیش ڈیڑھ لاکھ ہے۔ بلیک پول کی معیشت کا زیادہ تر انحصار یہاں کی سیاحت پر ہے۔ یہ UK کی سب سے مشہور سیاحتی تفریح گاہ سمجھی جاتی ہے۔

ہم نے باہمی مشاورت سے سی لائف سینٹر (Sea life center) بلیک پول ٹاور (Blackpool Tower) اور ساحلِ سمندر کا انتخاب کیا جس کے ٹکٹ آصف نے آن لائن خرید لئے۔ برطانیہ کے شمالی سمندری ساحل بے انتہا ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اسی مناسبت سے میں نے اپنے، آصف اور ہادی کے لئے گرم کپڑے روانگی سے پچھلے ہی روز بیگ میں ڈال لئے۔ یہاں بارش بھی خوب ہوتی ہے تو حفاظتی تدابیر کے پیشِ نظر چھتری بھی بیگ کے ساتھ ہی رکھ لی۔

یکم جون کو ہماری روانگی کا ٹارگٹ صبح ۹:۳۰ بجے کا تھا۔ جتنی دیر میں نے برتن سمیٹے، آصف سامان گاڑی میں رکھ آئے۔ میں نے بھاگم بھاگ گاؤن اسکارف پہنا اور ہادی اور آصف کے ہمراہ گاڑی میں جا بیٹھی۔

برطانیہ میں موسم گرما کے دن شیطان کی آنت کی مانند طویل ہوتے ہیں۔ دن ہوتا ہے کہ ڈھلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اگرچہ ہم اپنے ٹارگٹ سے آدھا پونا گھنٹہ دیر سے روانہ ہو رہے تھے مگر سیر سپاٹے کے لئے پورا دن موجود تھا چنانچہ اس معمولی سی تاخیر کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ بریڈفورڈ سے بلیک پول کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا ہے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ خوش قسمتی سے سورج کی سنہری کرنیں چار سو چمک رہی تھیں۔ انگلینڈ میں سورج بہت کم نکلتا ہے اور جب نکلتا ہے تو تمام چہرے دمک اٹھتے ہیں اور قدرتی مناظر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتے سفر طے ہوتا رہا یہاں

تک کے ہم بلیک پول شہر کی آبادی میں سے گزرتے ہوئے اپنی منزل سے کچھ ہی فاصلے پر رہ گئے۔ ہم نے پہلے بلیک پول ٹاور جانے کا ارادہ کیا۔ چند ہی لمحوں بعد ہمیں بادلوں کو چھوتا عظیم الشان اور بلند قامت مینا رنظر آیا جس پر برطانیہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ پارکنگ قریب ہی تھی مگر گاڑی پارک کرتے ہی حسنِ اتفاق یہ ہوا کہ بالکل سامنے ہی بلیک پول ٹاور تھا اور بائیں جانب سی لائف سینٹر تھا اور بلیک پول ٹاور اور سی لائف سینٹر کے سامنے وسیع وعریض ساحل تھا۔ گویا اتنی اچھی جگہ پارکنگ پر ہم دونوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ آصف گاڑی کا پارکنگ ٹکٹ لے کر لوٹے تو ہم نے بلیک پول ٹاور جانے کا ارادہ کیا حالانکہ سی لائف سینٹر چند قدم کی دوری پر تھا مگر آصف کے پیشِ نظر موسم کا سریع التبدل ہونا تھا۔ انگلینڈ میں بارش کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یک دم بادل آتے ہیں اور جل تھل ایک ہو جاتا ہے۔

ہم جب ٹاور پر پہنچے تو استقبالیہ (Reception) پر کھڑے شخص نے بتایا کہ چونکہ آپ نے ٹکٹ سی لائف سینٹر کی ویب سائٹ سے بک کرائی تھی اس لئے آپ کو پہلے سی لائف سینٹر جانا پڑے گا پھر بلیک پول ٹاور میں داخلہ کی اجازت مل سکے گی۔ ہم واپس پارکنگ سے ہوتے ہوئے سی لائف سینٹر کی عمارت کے سامنے جا پہنچے۔

سی لائف سینٹر (Sea Life Center)

آبی حیات کی اس نمائش گاہ میں مختلف انواع واقسام کی سمندری مخلوق aquariums میں رکھی گئی تھی۔ کچھ aqarium چھوٹے تھے جبکہ کچھ کا حجم پورے کمرے جتنا تھا۔ آغاز میں انتہائی چھوٹی مچھلیاں اور سمندری حیات رکھی گئی تھیں جبکہ آگے چل کر بڑی مچھلیوں کے aquarium رکھے گئے تھے۔ یہ نمائش گاہ آبی حیات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ یہاں ۵۰ Displays میں، سمندری گھوڑے اور جیلی فش رکھی گئی ہیں۔ بچوں اور بڑوں کا ایک جم غفیر مچھلیوں اور دیگر سمندری حیات سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ہم نے cord مچھلی کے aquarium کے عقب میں لگے بینچوں پر بیٹھ کر چپس کھائے اور تازہ دم ہو کر آگے روانہ ہوئے تو وہاں کا طلسماتی ماحول دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا ہم سمندر کی تہہ میں آبی حیات کے ہمراہ چل رہے ہیں۔ سمندری پودے اور درخت، نرم نرم زمین اور اردگرد بے شمار مچھلیاں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے مچھلیاں کئی فٹ بڑی ہوتی جا رہی تھیں کہ اچانک ہم ایسے راستے پر چل نکلے جہاں دونوں دیواریں شیشے کی بنی تھیں اور شیشے کی دوسری جانب کئی کئی فٹ طویل شارک مچھلیاں لمبے لمبے دونوکیلے دانتوں کے ساتھ ہر آنے جانے والے سیاح کو گھور رہی تھیں۔ کئی مچھلیاں بہت بڑی اور کاغذ کی مانند باریک تھیں۔ اوپر نظر پڑی تو یہاں کی چھت بھی شیشے کی تھی اور کچھ دیوقامت مچھلیاں ہمارے سر پر تیر رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق دیکھ کر زباں سے

مستقل ''سبحان اللہ'' کا ورد کررہی تھی۔ ہادی بھی مچھلیوں کے aquariums پراپنی چھوٹی سی انگلی رکھتا اور جب مچھلی اس کی جانب متوجہ ہوتی تو خوب لطف اندوز ہوتا۔ساتھ ہی ایک چھوٹا سا اسٹور تھا جہاں بچوں کے Stuffed Toys اور گیمز کے ساتھ ساتھ ایسی Shirts بھی رکھی گئی تھیں جن پر مچھلیوں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ جب ہم آبی حیات کی نمائشگاہ دیکھ کر باہر نکلے تو ابھی تک سورج کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ موسم بدستور خوشگوار تھا جو کہ باقی کی سیر کے لئے نیک شگون تھا۔

بلیک پول شہر میں زیادہ تر غیر مسلم اقوام ہیں جس کی بنا پر حلال ریستوران کی تعداد اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔ جب ہم ان تفریحی مقامات کی معلومات اکٹھی کررہے تھے تو ہمیں یہاں سمندر کے ساحل کے عین سامنے بنے کباب اور کری ریستوران کا علم ہوا مگر جب ہم نے پارکنگ کی جگہ سے اس ریستوران کے فاصلے کا معلوم کیا تو گاڑی پر ۱۰ منٹ کی دوری پر تھا۔اب مشکل یہ تھی کہ آصف نے رات ۳۰:۷ تک گاڑی کی پارکنگ ٹکٹ لے رکھی تھی اور تمام تفریحی مقامات گاڑی سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔اگر ہم گاڑی پر اس ریستوران جاتے تو واپسی پر پارکنگ کی جگہ نہ ملتی اور ٹکٹ بھی ضائع ہوجاتا۔اسی وجہ سے ہم نے پیدل کسی مناسب ریستوران کی تلاش شروع کردی۔ بھوک خوب چمک اٹھی تھی اور نظریں مستقل دائیں بائیں کسی اچھے ریستوران کی تلاش میں گھوم رہی تھیں کہ اچانک ہمیں سامنے 'فش اور چپس ٹیک اوے+ریستوران'' نظر آ گیا۔ ہم نے وہاں سے فش برگرز اور چپس کھائے جو کہ انتہائی مزیدار تھے۔ہادی صبح جلدی اٹھ گیا تھا اس لئے کھانا کھاتے ہی نیند میں جھولنے لگا۔

بلیک پول ٹاور (Blackpool Tower)

یہ تفریحی مقام ۱۴ مئی ۱۸۹۴ کو عوام الناس کے لئے کھولا گیا۔ اس کی Inspiration پیرس میں بنے ایفل ٹاور سے لی گئی ہے۔ اس مینار کی لمبائی ۵۱۸ فٹ اور ۹ انچ ہے۔جب پہلی بار اس ٹاور کو کھولا گیا تو کم وبیش ۳۰۰۰ افراد نے اس کی بالائی منزل تک کا سفر کیا۔ سیاح ٹاور میں داخلے اور بذریعہ لفٹ اوپر جانے کے لئے اس زمانے میں مجموعی طور پر ۱۶ پینس جمع کرایا کرتے تھے۔بلیک پول ٹاور کی بالائی منزل کو ''بلیک پول ٹاور آئی'' (Blackpool Tower Eye) کہا جاتا ہے۔اس پورے مینار کا رنگ وروغن ۷ سال میں مکمل ہوا۔ مینار کی عمارت کی چھت سے مینار کی بالائی منزل تک ۶۰۰ steps ہیں جن کے ساتھ ساتھ لفٹ بھی چلائی جاتی ہے۔ اگر ہوا کی رفتار ۷۲ کلومیٹر/ہاور (72km/hr) سے زیادہ ہوجائے تو حفاظتی تدابیر کے تحت مینار کو سیاحوں کے لئے بند کردیا جاتا ہے۔ اس ٹاور پر ۷ کلومیٹر طویل بجلی کی تاریں لگائی گئی ہیں جن سے مینار پر لگے ۱۰،۰۰۰ بلب

جلتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں ساحلِ سمندر کے کنارے تعمیر کردہ بلند وبالا ٹاور حسین منظر پیش کرتا ہے۔

ٹکٹ دکھانے کے بعد ہم زینے چڑھ کر اوپر کی منزل پر پہنچے اور دیوار پر لگے اشاروں کی مدد سے صحیح راستے کا تعین کرتے ہوئے کاریڈور سے گزرتے ہوئے بالآخر بلیک پول ٹاور کی entrance پر جا پہنچے۔ وہاں پر موجود انتظامیہ کے افراد نے ہمیں ایک کمرے کی جانب جانے کو کہا جہاں پہلے سے ۵۰۔۴۰ مزید افراد موجود تھے۔ ہم جب انتظار گاہ میں پہنچے تو وہاں چاروں طرف LED پر مختلف تصاویر دکھائی جارہی تھیں جنہیں دیکھ کر ہادی خوب لطف اندوز ہوا۔ چند منٹ گزرتے ہی ہمارے پیچھے لگا دروازہ کھولا گیا اور سیاحوں کو ادھر آنے کے لئے کہا گیا۔

یہ Tower کا 4D Cinema تھا۔ ہم نے 4D دیکھنے کے لئے خاص کالی عینکیں انتظار گاہ میں جانے سے پہلے ہی لے لی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ چند ہی لمحوں تک 4D چلایا جائے گا۔ ابھی لوگ کھڑے ہو ہی رہے تھے کہ زوردار ہوا نے سب کو چونکا دیا اور یکدم سامنے والی دیوار پر تصاویر رقص کرنے لگیں۔ کبھی پرندے اڑتے آتے اور پَر پھڑ پھڑاتے ہوئے ہم سے ٹکرا جاتے۔ کبھی بارش کے قطرے ہم پر گرتے اور ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگتیں۔ آخر کو ٹاور کو میزائل کی طرح ہوا میں چھوڑتے دکھایا گیا کہ ہماری زمین اس بری طرح تھرتھر کانپنے لگی کہ ہم بھی اس خلائی سفر میں کافی بلندی تک جا پہنچے۔ Documentary بند ہونے سے قبل آتش بازی ہوئی جس کی روشنی بہت شدت سے ہمارے چہروں پر پڑی۔ ہادی بہت بہادری کے ساتھ اپنے بابا کی گود میں سب کچھ دیکھتا رہا۔ جب ہم یہاں سے فارغ ہوئے تو لائن بنا کر لفٹ کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔

جب ہم اپنی باری پر لفٹ میں داخل ہوئے تو دل خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ لفٹ اوپر جاتی جارہی تھی جارہی تھی اور بلند اور بلند.....ہم زمین کو لفٹ میں بنی شیشے کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بہت دور جارہی تھی۔ گاڑیاں، گھر گویا ہر چیز microszcopic ہوتی جارہی تھی۔ جونہی لفٹ کھلی اور ہم باہر نکلے تو اس منزل کے فرش کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ فرش شیشے کا تھا اور سڑک کے اوپر بنا ہوا تھا۔ قدموں کے نیچے سڑک پر گزرتی گاڑیوں کا نظارہ با آسانی مگر خوف کے عالم میں کیا جا سکتا تھا۔ اتنی بلندی سے اس فرش پر چلنا جس کے نیچے کئی سو فٹ دور زمین نظر آتی ہو کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ہم کنارے کنارے سے ہو کر وہاں سے گزرے جہاں فرش شیشے کا نہ تھا اور کھڑکی کے قریب پہنچے۔

''اُف اتنی بلندی! یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟''

مگر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ابھی دو تین

منزلیں اور بھی اوپر ہیں جہاں سیڑھیوں کی مدد سے چڑھ کر جانا ہے۔ میں نے اور آصف نے ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی کہ کون بہادری سے اس شیشے کی زمین پر چل سکتا ہے۔ مگر جونہی ایک قدم اوپر رکھتے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا۔ ہاں البتہ اگر کوئی نیچے نہ دیکھے اور آنکھیں بند کر کے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اوپر سے گزر جائے تو یہ ممکن تھا۔ ہادی بڑے مزے سے اوپر چڑھ جاتا اور بلاخوف وخطر واپس بھی آ جاتا۔ میں نے بھی بڑے حوصلے سے اور مضبوط دل کے ساتھ اوپر چند چکر لگائے۔ آصف بھی خوب ڈرے مگر آنکھیں بند کر کے اوپر سے گزرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہم زینوں کے ذریعے مزید بالائی منزلوں پر پہنچے۔ ایک جانب ساحلِ سمندر اور سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں نظر آتیں تو دوسری جانب چھوٹے چھوٹے مکانات اور کھلونا گاڑیوں سے بھی چھوٹی گاڑیاں اور بسیں سڑکوں پر چکر لگاتی نظر آتیں۔ ہم واپس اُسی منزل پر آ گئے جہاں شیشے کا فرش تھا۔ ہم نے پھر ہمت کر کے اس خوفناک اور دل لرزا دینے والے فرش پر چکر لگائے۔ جب ہم لفٹ کے ذریعے واپس جانے کا سوچ رہے تھے تو ایک دیوار پوری شیشے کی بنی ہوئی نظر آئی۔ ہادی اپنا عکس شیشہ میں دیکھتا اور خوب لطف اندوز ہوتا۔ طرح طرح کے style بناتا اور شیشہ میں خود کو دیکھ کر انجوائے کرتا۔ جب ہم واپس لفٹ سے نیچے اترے اور Tower building سے باہر نکلے تو ہم نے مُڑ کر اس بلند مینار کو دیکھا جس کا آخری کنارہ آسمان کو چھوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور ہم وہاں سے زمین کا نظارہ کر کے واپس لوٹے تھے۔ ٹاور آئی (Tower Eye) کے عین سامنے ساحلِ سمندر تھا۔

ساحلِ سمندر، بلیک پول

ہم نے کچھ دیر ساحل کے کنارے بیٹھ کر لہروں سے لطف اندوز ہونے کا فیصلہ کیا۔ پہلے ہم کچھ فاصلے پر لگے بینچوں پر بیٹھ گئے۔ ہادی ہمارے اردگرد چکر کاٹتا رہا۔ میری توقعات کے برعکس آج ساحل کا موسم بہت خوشگوار تھا اور ٹھنڈ بھی قابل برداشت تھی۔ میں گرم کپڑے لائی تھی مگر صرف جیکٹس سے ہی خوب فرق پڑ گیا تھا۔ البتہ ہادی کو میں نے ٹوپی اور دستانے پہنا دیئے تھے۔

تھوڑی دیر beach پر بیٹھنے کے بعد ہم نیچے سیڑھیاں اتر کر سمندر کی تلاطم خیز موجوں سے چند فٹ کے فاصلے پر جا بیٹھے۔ ٹھنڈے پانی کی لہریں دور سے اٹھتی ہوئی آتیں اور قریب آ کر مزید اونچی ہو جاتیں اور جب ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے چہروں پر پڑتے تو دل کو بہت سکون ملتا۔ ہادی بڑے آرام سے ساحل کے کنارے بیٹھ کر لہروں کو دیکھتا رہا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہاں ہادی شرارتیں نہ کرے مگر ہادی نے الحمدللہ بالکل بھی پریشان نہ کیا اور بڑے سکون سے ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ شاید وہ قدرے حیران تھا اور اپنے ننھے منے ذہن میں یہ سوچ رہا تھا کہ

''یہ سامنے پانی کو کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے ہادی کو تھوڑا سا کیک کھلایا تو اسے پھر نیند آنے لگی۔ آج ہادی دوپہر کو بھرپور نیند نہیں لے سکا تھا۔ فوراً ہی سو گیا اور جب ہماری گاڑی واپسی کے سفر کی جانب گامزن تھی تب نیند سے جاگا۔ میں نے سفر کے آغاز سے قبل بلیک پول کا موسم انٹرنیٹ کی مدد سے معلوم کیا تھا جس کے مطابق دوپہر ایک سے دو بجے کے درمیان بارش کا امکان تھا۔ مگر خدا کی قدرت کی جتنی دیر ہم وہاں رہے سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا رہا اور جیسے ہی واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے تو گہرے بادل اور رم جھم ہونے لگی۔

''سفر وسیلۂ ظفر''

یہ بات اب سمجھ آ رہی تھی۔ دل آج گزرے حسین لمحات کی بنا پر بے حد خوش تھا۔ آج ہم نے اپنی آنکھوں سے نئے مناظر اور نئی تصاویر کے رنگ بھرے تھے۔ ہادی اپنے بابا سے اپنی سالگرہ کا تحفہ لے کر اپنی ننھی منی آواز میں ''بابا! بابا!'' کہہ رہا تھا جیسے اتنے اچھے گفٹ پر بابا کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔

☆☆

درِ محبوب پر

میں مدت سے اس آس پر جی رہی ہوں
کبھی تو بلائے گا وہ اپنے گھر میں
کبھی تو سنے گا دعائیں وہ میری

وہ ضرور بلاتا ہے۔ اب بھی امید تھی کہ وہ ضرور بلائے گا۔ جانے کی لگن تو ہے لیکن جانے کے تقاضے بھی پورے ہونے چاہئیں۔ اے میرے پیارے رب ..... تیری بے نیازیوں کے رنگ نرالے ہیں۔ کبھی دل کی چاہت ہی جنت کے داخلے کا باعث بن جاتی ہے۔ کبھی عمل کے اندر بھی نیت کے کھوٹ سے پکڑائی ہو جاتی ہے۔

میرے مولا! میں بھی تیری بندۂ گناہ گار ہوں۔ پہلے بھی تیرے گھر آئی تھی، مہمانی کا لطف اٹھایا تھا۔ اب پھر دل چاہتا ہے کہ مجھے بلا لے اپنے گھر میں۔ اس دنیا سے جانے سے پہلے۔ دو تین دفعہ تو تیار ہو چکے۔ ابھی بھی امید و یاس کی کیفیت ہے۔ محبوب کے گھر جانے کی جو آس و لگن ہے اس میں بھی ایک سرور ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے۔ وہ محبوب کے گھر جانے کی لگن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیدل ہی چل پڑے۔ کسی صحرا سے گزر رہے تھے۔ ایک بکریوں کا ریوڑ ملا۔ بکریاں پیاس سے بلبلا رہی تھیں۔ ایک جگہ پانی ملا پی کر آرام سے لیٹ گئیں۔ پانی کا اضطراب ختم ہو گیا۔ بزرگ بکریوں کو بغور دیکھتے رہے۔ اپنے ساتھیوں سے آگے جانے کی معذرت کر لی کہ میں ان بکریوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ان کی پانی کی جستجو ختم ہو گئی تو یہ سست پڑ گئیں۔ اگر محبوب کے در پر پہنچ کر میرا بھی یہی حال ہوا تو ..... مجھے یہ اضطراب اور لگن ہی عزیز ہے یہ کہہ کر آگے جانے سے انکار کر دیا۔ یہ تو بہت اونچے درجے کی محبت ہے۔ جس میں ملنے کی تڑپ ہی ایک سرمایہ ہے۔ اس کے در پر جا کر حاضری کے بعد بھی کون سا کم ہوتا ہے۔ اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔

اللہ تعالیٰ کو اس بندی پر ترس آ ہی گیا ..... اپنے گھر پہنچا ہی دیا۔ الٰہی! یہ تیرا افضل ترین گھر اور میں .....واقعی میں یہاں پہنچ گئی اے رب کعبہ سچ .....؟

کیا کشش ہے اس کالے گھر کے اندر ..... دنیا کھنچی چلی آ رہی ہے۔ کیا رنگ پسند کیا! تیرے کعبے کا رنگ بھی کالا تیرے محبوب کی کملی بھی کالی ..... میں طواف کر کے بیٹھ گئی۔ اس کالے گھر کو مسلسل تک رہی ہوں۔ اس کے گرد طواف کرنے والوں کو دیکھ رہی

ہوں۔ الٰہی! کتنی مخلوق ہے ہر نسل، ہر رنگ کالے گورے ہر ملک، ہر شہر سے یہ جم غفیر..... یہ دیوانوں کی بھیڑ اگر یہ سب ایک ہو جائیں تو فلسطینیوں کی مشکلات ، کشمیریوں کے مصائب اور برما کے مسلمانوں کی کسمپرسی ختم ہو جائے۔

کوئی اس طواف کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو اسے کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا حاصل کرنے کے لیے وقت اور سرمایہ لگا کر اب یہ یونہی دیوانے پروانوں کی طرح شمع کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ مجھے یوں لگا۔

یہ دیوانوں کی بستی ہے یہاں دیوانے بستے ہیں

رب کی میزبانی ہے، اسی نے سب کو بلایا ہے۔

تم سب خوش ہو جاؤ کہ یہ بخشش کے رستے ہیں۔ کوئی پیدل ہی چلا آیا تو کوئی سواری پر۔ یہ حرم کے مسافر ہیں۔ کوئی روتا ہے گناہوں پر، کوئی نادم ہے خطاؤں پر ..... یہ تجھے متوجہ کرتے ہیں غضب تیرے سے ڈرتے ہیں۔ رب کعبہ بخش دے میرے گناہوں کو ..... بدل دے میرے عصیاں کو نیکیوں سے..... تیرا کرم ہو جائے تو میری تقدیر بدل جائے۔

سعی کرنے چلی ہوں تو حضرت ہاجرہ کی یاد آتی ہے۔ اے رب! تیری شان ہے۔ ابراہیمؑ خانہ کعبہ تعمیر کرتے ہیں تو ان کے نقش پا کو مقامِ ابراہیم مصلیٰ بنا دیا۔ بیوی اگر صفا مروہ پر اپنے قدموں سے بار بار پانی کی تلاش میں چکر لگاتی ہے تو اس کی چلت پھرت کو بھی رب نے کیسا نوازا کہ اس کی تقلید کے بغیر مناسک حج وعمرہ ادا نہیں ہوتے۔ کیا مقام ہے اس خاتون کا.....سبحان اللہ!

یہاں بھی مادی نظر لوگوں کے ساتھ ساتھ صفا مروہ کا چکر کاٹ کر کچھ ڈھونڈتے ہوئے پوچھ رہی ہے۔ ان کو کیا ملے گا یوں بھاگے بھاگے پھرنے میں! کبھی آہستہ، کبھی تیز .....روحانیت بتا رہی ہے کہ اس رب کی اطاعت کا سرور انھیں لیے لیے پھرتا ہے۔ ہے نا پھر یہ دیوانوں کی بستی ..... جہاں دیوانگی اپنا کام کر جاتی ہے۔ باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار۔

میں بھی حضرت ہاجرہ کی تقلید میں کبھی صفا کبھی مروہ کے چکر کاٹ رہی ہوں اور اللہ تعالیٰ کو جتا رہی ہوں۔ اے میرے پیارے رب! ہاجرہ ماں کی تو سعی قبول کر لی۔ وہ عظیم ماں تھی میں ایک گناہگار بندی ہوں ..... پر ہوں میں بھی ایک ماں .....تو نے ایک ماں کی سعی کو مشکور کر ڈالا۔ الٰہی! میں بھی اک ماں ہوں .....میری بھی اس سعی کو مشکور کر دے۔ میں بھی اپنی محبت کو ترے لیے قربان کر دوں ..... الٰہی! مجھے بھی ہاجرہ کا سا صبر و استقامت عطا کر دے ..... میرے بچوں کو بھی آداب اسماعیلی سکھلا دے!

☆☆☆

آج مدینہ جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ لیکن بار بار دل ہی میں شرمندہ ہو رہی ہوں کہ امتی ہونے کے ناطے جو کام کرنے کو ملے تھے وہ غفلت کا شکار ہوئے اب کس منہ سے سامنا ہوگا۔ اگر آج ہی باز پرس ہو

جائے تو.....آ قاؐ کی محبت کھینچے لیے جاتی ہے۔ میں کیا جاتی ہوں .....قدم لرزیدہ لرزیدہ نظر شرمندہ شرمندہ مسجد نبوی پہنچ گئے۔ جہاں اب بہت پہلے کی طرح ہر وقت روضۂ رسولؐ پر حاضری کی اجازت نہیں۔ تین وقت مقرر کر دیے گئے ہیں خواتین کے لیے نماز فجر، ظہر اور عشاء کے بعد۔ خواتین کو خاص اہتمام کے ساتھ لے جایا جاتا ہے کیونکہ شرک کرنے میں عموماً خواتین آگے ہوتی ہیں۔ اگر آرام سے جائیں تو شاید سب لوگوں کو آرام سے ریاض الجنۃ میں نفل پڑھنے کا موقعہ مل جائے لیکن جلد بازی میں مصنوعی رش اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی سجدہ میں ہے اور خواتین کا ریلا آ گیا تو پھر مسجود کا اٹھنا محال ہے۔

میں نفل پڑھ کر ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی ہوں۔ پیارے نبیؐ کا دور یاد آتا ہے۔ اصحاب صفہ، امہات المومنین کا خیال آتا ہے تو اپنے آپ کو بے حد حقیر پاتی ہوں۔ دل کو تسلی دے لیتی ہوں کہ رب میری محبت رسولؐ کو کوئی درجہ تو دے ہی دے گا۔ بے شک مصعبؓ بن عمیر نہیں ہوں اور نہ حضرت سمیہؓ و آسیہؓ۔ لیکن میرے ارادے میری نیت تو پیارے نبیؐ کو راضی کرنے کے ہیں۔ میرا پیارا رب میری نیت سے ہی پار لگا دے گا ان شاءاللہ۔

کبھی یوں لگتا ہے کہ اللہ نے یہاں پہنچا کر میرے اندرون کو میرے سامنے رکھ دیا ہے۔ اپنے اعمال کو دیکھتی ہوں تو انتہائی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ نبیؐ کی محبت میں سرخرو ہو گئے تو گویا رب دو جہاں کے امتحان میں سرخرو ہو گئے۔ اللہ ہمیں نبی پاکؐ کے قدموں کی خاک بنا دے .....ان کی سچی پیروی سکھا دے۔ آمین

☆☆☆

ملکہ خیزران

خلیفہ محمد المہدی عباسی سلطنت کا تیسرا فرمانروا تھا۔اس کے دور میں عباسی سلطنت میں ہر طرف امن چین تھا۔ان کے دور حکومت میں بنوامیہ کا نام ونشان تک ختم ہو چکا تھا۔ بنوامیہ تقریباً ایک صدی تک عالم اسلام پر حکمران رہے۔ بنوعباس نے جب ان کا تختہ الٹا تو انہوں نے اس بدنصیب خاندان کے لوگوں کو چن چن کر مار ڈالا۔صرف وہی لوگ زندہ بچے جو کسی نہ کسی طرح روپوش ہو گئے۔

ملکہ خیزران خلیفہ مہدی کی چہیتی ملکہ تھی۔ وہ بہت دانشمند نیک سیرت اور مخیّر خاتون تھی۔ اپنی بے پناہ خوبیوں کی بدولت وہ اپنے شوہر کے مزاج پر پوری طرح حاوی تھی۔ان کی سفارش پر خلیفہ المہدی نے بنی امیہ کے بہت سے معتوب امیروں کی ضبط شدہ جاگیریں واپس دے دیں۔

ایک دن ملکہ خیزران اپنے محل میں بہت شان وشوکت سے بیٹھی تھی کہ ایک لونڈی نے آکر عرض کیا۔

''ملکہ عالم!محل کی ڈیوڑھی کے دروازے پر ایک نہایت ہی خستہ حال غریب عورت کھڑی ہے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کہنا چاہتی ہے۔''

ملکہ نے کہا''اس عورت کا حسب نسب معلوم کرو اور یہ بھی پوچھو کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے؟''

لونڈی نے باہر آکر عورت سے بہتیرا پوچھا لیکن اس نے نہ اپنے نسب اور خاندان کا پتہ دیا ورنہ ہی یہ بتایا کہ وہ ملکہ سے کیوں ملنا چاہتی ہے۔اس کا بس ایک ہی جواب تھا کہ وہ جو کہنا چاہتی ہے خود ملکہ سے زبانی کہے گی۔لونڈی نے اندر آکر ملکہ کو اس عورت کا جواب سنایا تو وہ بہت حیران ہوئی۔اس وقت صحابی رسولؐ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی پڑپوتی زینب بنت سلیمان بھی اس کے پاس بیٹھی تھیں وہ بنوعباس کی خواتین میں بہت دانا تسلیم کی جاتی تھیں۔ملکہ نے ان سے مشورہ کیا کہ اس عورت کو اندر آنے دوں یا باہر سے ہی روانہ کر دوں۔

انہوں نے کہا''ضرور بلاؤ، بھلا دیکھیں تو وہ کیا چاہتی ہے؟''

چنانچہ ملکہ نے اس لونڈی کو حکم دیا کہ اس عورت کو اندر لے آؤ۔تھوڑی ہی دیر میں ملکہ کے سامنے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک انتہائی خستہ حال عورت کھڑی تھی۔اس کے دلکش خدوخال سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شریف زادی ہے لیکن میل کچیل اور بوسیدہ کپڑوں نے اس کی حالت گداگروں سے بھی بدتر بنا رکھی تھی۔ وہ عورت پہلے تو ملکہ کا کروفر دیکھ کر ٹھٹھکی مگر پھر فوراً ہی

جرأت کر کے ملکہ کو سلام کیا اور کہنے لگی۔

''اے ملکہ! میں مروان بن محمد کی بیٹی مزنا ہوں، جو خاندان بنوامیہ کا آخری تاجدار تھا۔''

جونہی اس عورت کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ملکہ خیزران نے کہا ''اے بد بخت عورت، تیری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تو اس محل میں قدم رکھے۔ کیا تو نہیں جانتی تیرے اہل خاندان نے عباسیوں پر کیسے خوفناک مظالم ڈھائے۔ اے سنگدل کیا تو وہ دن بھول گئی جب بنوعباس کی بوڑھی عورتیں تیرے پاس یہ التجا لے کر گئی تھیں کہ تو اپنے باپ سے سفارش کر کے میرے شوہر مہدی کے چچا امام محمد بن ابراہیم عباسی کی لاش دفن کرنے کی اجازت لے دے۔ کم بخت عورت خدا تجھے غارت کرے تو نے ان معزز اور مظلوم خواتین پر ترس کھانے کی بجائے انہیں ذلیل کر کے محل سے نکلوا دیا، کیا تیری یہ حرکت انسانیت کی توہین نہیں تھی؟ مانا کہ آپس میں دشمنی تھی لیکن پھر بھی ایک بے بس اور لاچار دشمن کے ساتھ ایسا سلوک جائز نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم سے حکومت چھین لی اور تمہیں ذلیل کیا۔ مزنا خیریت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ!''

مزنا ملکہ کی باتیں سن کر خاموش رہی اور بالکل مرعوب نہ ہوئی بلکہ اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولی ''بہن! اپنے آپے سے باہر نہ ہو، جو کچھ میں نے کیا خدا سے اس کی سزا پائی۔ خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے وہ سچ ہے اس کی پاداش میں خدا نے مجھے ذلیل وخوار کر کے تمہارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کسی وقت میں تم سے زیادہ شوخ اور شریر تھی۔ دولت اور حشمت میرے گھر کی لونڈی تھی۔ مجھے اپنے حسن پر ناز تھا اور تکبر نے مجھے اندھا کر رکھا تھا مگر تم نے دیکھا جلد ہی زمانے نے اپنا ورق الٹ ڈالا۔ خدا نے اپنی تمام نعمتیں مجھ سے چھین لیں۔ اب میں ایک فقیر سے بھی بدتر ہوں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو؟ اچھا خوش رہو، میں جاتی ہوں۔''

اتنا کہہ کر مزنا نے تیزی سے باہر کا رخ کیا لیکن ابھی چند قدم جانے پائی تھی کہ خیزران نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور چاہا کہ گلے سے لگا لے لیکن مزنا نے پیچھے ہٹ کر کہا ''خیزران تم ملکہ ہو اور میں ایک غریب اور بے کس عورت میرے کپڑے بوسیدہ اور غلیظ ہیں میں اس قابل نہیں کہ ایک ملکہ مجھ سے بغلگیر ہو۔''

خیزران نے آبدیدہ ہو کر لونڈیوں کو حکم دیا کہ مزنا کو نہلا دھلا کر اعلیٰ درجے کی پوشاک پہناؤ اور پھر اسے عطر میں بسا کر میرے پاس لاؤ۔ لونڈیوں نے ملکہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اس وقت مزنا کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ چاند بدلی سے نکل آیا ہے۔ خیزران بے اختیار اس سے لپٹ گئی اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا ''دسترخوان بچھواؤں؟''

مزنا نے کہا ''ملکہ آپ پوچھتی کیا ہیں شاید مجھ سے زیادہ اس محل میں اور کوئی بھوکا نہ ہوگا۔''

فوراً دسترخوان بچھ گیا۔ مزنا سیر ہو کر کھا چکی تو ملکہ

نے پوچھا ''آج کل تمہارا سرپرست کون ہے؟''

مزنا نے سرد آہ بھر کر کہا آج کس میں ہمت ہے کہ میری سرپرستی کرے۔ مدتوں سے دردر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ کوئی رشتہ دار بھی دنیا میں موجود نہیں کہ اس کے ہاں جا پڑوں بس کچھ قرابت ہے تو وہ اسی گھرانے بنوعباس سے ہے۔''

خیزران نے فوراً کہا ''مزنا آرزدہ مت ہو، آج سے تم میری بہن ہو۔ میرے بہت سے محل ہیں تم ان میں سے ایک محل پسند کرلو اور یہیں رہو جب تک میں جیتی ہوں تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گی۔''

چنانچہ مزنا نے ایک عالی شان محل پسند کرلیا اور خیزران نے اس میں تمام ضرورت زندگی اور لونڈی غلام مہیا کر دیئے ساتھ ہی پانچ لاکھ درہم نقد بھی اس کے حوالے کیے کہ جس طرح جی چاہیے خرچ کرے۔

شام کو خلیفہ مہدی حرم میں آیا اور دن بھر کے حالات پوچھنے لگا۔ ملکہ خیزران نے اسے آج کا واقعہ تفصیل سے سنانا شروع کیا جب اس نے بتایا کہ میں نے مزنا کو اس طرح جھڑکا اور وہ قہقہہ لگا کر شان بے نیازی کے ساتھ واپس چل دی تو خلیفہ فرطِ غضب سے بے تاب ہوگیا اور اس نے ملکہ کی بات کاٹ کر کہا ''خیزران تم پر ہزار افسوس ہے کہ خدا نے تمہیں جو نعمتیں عطا کی ہیں تم نے ان کا شکریہ ادا کرنے کا ایک بیش بہا موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ تمہاری یہ حرکت ایک ملکہ کے شایان شان نہیں تھی۔''

خیزران نے کہا امیر المومنین میری پوری بات تو سن لیں اس کے بعد جب اس نے مزنا سے حسن سلوک کی تفصیل سنائی تو مہدی کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے خیزران کی اعلیٰ ظرفی کو بہت سراہا اور کہا آج سے میری نظر میں تمہاری قدر دوچند ہوگئی ہے۔ پھر اس نے اپنی طرف سے بھی مزنا کو اشرفیوں کے سو توڑے بھیجے اور ساتھ ہی کہلا بھیجا آج میری زندگی کا سب سے بڑا یوم مسرت ہے کہ اس نے ہمیں تمہاری خدمت کی توفیق دی۔ اب تم اطمینان سے یہاں رہو۔

اس کے بعد مزنا طویل عرصہ تک زندہ رہی۔ مہدی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہادی بھی مزنا کی بے حد تعظیم وتکریم کرتا تھا۔ ہادی کے بعد اس کا بیٹا ہارون الرشید خلیفہ بنا تو اس نے بھی مزنا کو ماں کے برابر سمجھا۔ اس کے عہد خلافت کی ابتدا میں مزنا نے وفات پائی تو ہارون الرشید بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا اور اس کے جنازے کو شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ قبرستان پہنچایا۔

ملکہ خیزران کے بطن سے مہدی کے دو بیٹے موسیٰ ہادی اور ہارون الرشید پیدا ہوئے۔ دونوں باپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگر خلیفہ ہوئے بدقسمتی سے خلیفہ ہادی ماں کا اطاعت گزار نہ نکلا اس نے ملکہ خیزران کو ان تمام اختیارات سے محروم کر دیا جو اسے خلیفہ مہدی کے زمانے میں حاصل تھے۔ مگر اس کا زمانہ حکومت نہایت مختصر تھا۔ اس نے پندرہ ماہ بعد وفات پائی اور ہارون

الرشید مسند نشین ہوا۔ اس نے ماں کے تمام اختیارات بحال کر دیئے اور اس کے اعزاز و اکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ملکہ خیزران بہت فیاض اور رحمدل تھی۔ کوئی مصیبت میں مبتلا ہوتا تو اس کی مصیبت دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ اس طرح محتاجوں، ضرورتمندوں کی دل کھول کر مدد کرتی رہتی تھی۔ اس لئے وہ عوام الناس میں بے حد ہر دلعزیز تھی اور وہ اس کا نام نہایت عزت واحترام سے لیتے تھے۔ اس نیک دل ملکہ نے بعہد ہارون الرشید ۱۷۳ھ میں وفات پائی۔

(استفادہ: تاریخ اسلام، تاریخ اسلام کی چار سو باکمال خواتین از طالب ہاشمی) ☆☆

اُنچاس برس پہلے

آج وہ بنگلہ دیش جس میں متحد پاکستان کا ساتھ دینے والوں کو 42 برس پرانے جرم کی سزا دی جارہی ہے، وہاں ملک کی سلامتی کے لئے کام کرنے والوں پر اس وقت سانحہ مشرقی پاکستان سے سات سال قبل کیا گزر رہی تھی، ڈھاکہ کی جیل سے ہونے والی خط وکتابت ''لمعاتِ زنداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ خرم مراد مرحوم کے خطوط کے نئے ایڈیشن میں شامل ابتدائیہ ان کی اہلیہ کے قلم سے۔

یہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

۲ جنوری ۱۹۶۴ء کی صبح وہ صبح تھی جس کا انتظار اور جس کی توقع پچھلے اڑھائی ماہ سے تھی۔ ہر رات یہ خیال آتا کہ آج کی رات شائد آزادی کی آخری رات ہو۔ اور ہر صبح یہ دھڑکا کہ آج کا دن شاید آخری یوم آزادی ثابت ہو۔ ان دنوں بڑی خوشی کے ساتھ قلب وذہن آنے والے کٹھن فرائض اور سخت مراحل کے بارے میں سوچتے رہے اور کچھ نہ کچھ ان کو انگیز کرنے کی تیاری بھی کرتے رہے۔

میرا چھوٹا سا گھر جس کی کل آبادی دو افراد اور چار ننھے ننھے بچوں پر مشتمل ہے اس میں سے ایک ذمہ دار ہستی کا کنارہ کش ہوجانا، وہ بھی ایسی جو گھر کی رونق ہو، جو گھر کی روحِ رواں ہو، سوچتی تو دل گھبرا گھبرا اٹھتا اور عجیب وحشت سی لگتی لیکن ہونے والے واقعات کو ان سب باتوں سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ بہرحال وہ گھڑی بھی آ ہی گئی۔

صبح مجھے اٹھایا، تو معلوم ہوگیا کہ اٹھایا گیا ہے۔ اٹھتے ہی کھڑکی کا پردہ اٹھایا..... سامنے جیپ اور پولیس کے باوردی سپاہی نظر آئے۔ چند لمحے دل زور سے دھڑکا، قدم کانپے اور پھر جلدی سے دل ٹھہر گیا اور قدم جم گئے۔

دن بھر کوئی صحیح اندازہ نہ ہوسکا کہ کیا کرنے والے ہیں۔ لاکھوں اندیشے اور خیال ذہن کی آماج گاہ بنے رہے۔ کبھی خیال ہوتا گرفتاری نہیں ہوگی۔ دفاتر سربہ مہر کردیئے گئے، زبانوں پر پہرہ لگا دیا گیا، کام روک دیا گیا، پھر گرفتاری کی کیا ضرورت۔ اور کبھی یہ خیال کہ جب کچلنے اور ختم کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تو موقع سے جتنا فائدہ اٹھا سکیں گے، کسر نہ چھوڑیں گے۔

مغرب کے وقت اطلاع ملی کہ انٹیلی جینس بیورو کے دفتر سے ڈھاکا جیل منتقل کردیا گیا ہے۔ بہت مختصر سی خبر تھی، لیکن ایک ذی حیات کا تعلق آزاد دنیا کے ہر تعلق سے منقطع کرگئی۔ ایک ہی جگہ رہتے ہوئے، ہمارے درمیان نہ ختم ہونے والا فاصلہ حائل ہوگیا، اور جدائی کی غیر متعین دیوار کھڑی ہوگئی۔

ایک طرف یہ احساس یہ کہ جیسے ہزاروں کانٹے

جسم وروح کے رگ وریشے میں پیوست ہیں، دنیا میں اندھیر ہو چکا ہے، اور میں تنہا اپنے ویران گھر میں کھڑی ہوں، چھوٹے چھوٹے بچوں اور بڑی بڑی ذمہ داریوں کی گراں باری شانے محسوس کر رہے ہیں۔ اور پھر یہ خیال کہ کیسے رکھیں گے، کہاں رکھیں گے، کیا سلوک کریں گے اور کیا گزر رہی ہوگی۔

دوسری طرف ایک ٹھنڈی میٹھی طمانیت تھی۔ کیا واقعی اللہ نے ہمیں آزمانے کا فیصلہ کرلیا، خوش قسمتی کی گھڑی آ گئی؟ کیا ہم اللہ کے دین کے مددگاروں کی فہرست میں شامل ہو گئے؟ ہمارا ایمان اس لائق تھا کہ کسوٹی پر پرکھا جا سکے؟ ایک باہوش مسرت دکھے ہوئے جذبات پر چھا جاتی، پھر ہر ٹیس ایک نیا لطف دیتی، جس میں سرور تھا، سوز تھا، نیاز تھا اور تشکر و اطمینان تھا۔

یہ سب اس کے لئے تھا جس کی محبت کا دم بھرتے رہے اور جس کے دین کی خدمت کرنے کی دعا مانگتے رہے۔ اس کے لئے، قوتیں اور توفیق طلب کرتے رہے، اور جس کی راہ میں ایثار و قربانی کی آرزوئیں اور تمنائیں کرتے رہے۔

سچ مچ ہماری طلب صادق تھی؟ سچ مچ ہمارے دلوں میں تمنائے مضطر تھی، اور سمیع وبصیر، علیم وخبیر، آقائے واحد نے دعاؤں کی قبولیت کا شرف بخش دیا تھا؟

پھر ناامیدی، پژمردگی اور بے کسی کا کیا سوال باقی رہ جاتا ہے!

میں نے اپنے اندر کبھی اتنی گرمی اور تازگی محسوس نہیں کی جتنی اس وقت ہوئی۔ اپنے ہر مسئلہ کی سمجھ اور بوجھ ایک دم پیدا ہوگئی۔ اپنی ذمہ داریوں کے احساس والے لمحات میں مجھے کسی قوت کا ساتھ محسوس ہوتا تھا۔ راتوں کی تنہائیوں میں کوئی میری خبر گیری کرتا تھا۔ میرے دل کو اطمینان وقوت عطا کرتا تھا۔ یہ اس کے سوا اور کون تھا، جو غالب اور کارآفرین کا رکشا اور کارساز ہے۔

فرض کی ادائیگی کا احساس، اذیتوں اور روحانی بے قراریوں کے بھڑکتے شعلوں کو گل زار بنا دیتا۔ زندگی کچھ کرنے کے لئے ہے، اور ہم خوش تھے کہ کچھ کرنے کی تمنا رکھتے ہیں، کچھ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس نے اس زندگی میں اطمینان وعیش کی جستجو کی، وہ برباد ہوا، اس کی سعی لاحاصل رہی، اسے روح کی مسرت کبھی نصیب نہ ہوئی۔ ''آخرت کی زندگی ہی بہترین زندگی ہے۔'' یہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس پر جتنا سوچو جتنا غور کرو، دل اس قول کی سچائی اور صداقت پر جھکتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس ہستی کی ہیبت اور جلال اور جمال سے دل معمور ہو جاتا ہے جو انسانی نفسیات کا عظیم معلم ہے، جو انسانی فطرت کا جلیل القدر نباض ہے، جو مسرت کے چشموں کا علیم وخبیر ہے۔ وہ ان کا نشان بتاتا ہے، ان کا پتہ بتاتا ہے، ان تک پہنچنے کی راہیں دکھاتا ہے، لیکن عجلت پسند انسان، مشکلات سے ڈر کر بیٹھ رہتا ہے۔ کتنے ہیں جو راہ کے پھولوں کو

ہی منزل سمجھ بیٹھتے ہیں، اور کتنے ہیں جوراہ کے خاروں سے اپنا دامن نہیں چھڑا پاتے۔

اللہ کا شکر واحسان کہ اس نے ہمیں ایک زندہ شعور دیا، زندگی کی حقیقتوں کا علم دیا، اور پھر صرف اسی پر نہیں چھوڑا، بلکہ ان تک پہنچنے کا بھرپور موقع بھی عنایت کیا۔ اپنے خاص کرم اور لطف وعنایت سے اس راہ کو ہمارے سامنے کھول دیا اور پھر راہ کے مستقیم ہونے کا یقین اس طرح دل میں جاگزیں کر دیا کہ لاکھ طوفان وحوادث پیش آئیں ہم ان شاء اللہ اپنی راہ پر قائم رہیں گے۔ سب کا مقابلہ کرتے ہوئے اسی راہ پر چلتے رہیں گے، رکاوٹیں اور زنجیریں ہمارا دل کھٹا نہیں کر سکتیں۔ اور ایک مسافر کے لئے صحیح راہ کا تعین اور یقین بہت بڑی دولت ہے!

حوصلوں، امنگوں اور امیدوں کا ایک نیا جہاں آباد ہو چکا تھا اور ہر دم اللہ سے قربت۔ اب میں سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ احساسات اتنے یک سو اور اللہ کے خیال میں رنگے ہوئے تھے کہ شاید ایسے ہی احساسات حج کے موقع پر اور جہاد کے موقع پر طاری ہوتے ہوں گے۔

اللہ یہ کتنا بڑا کرم اور کتنا عظیم احسان تھا کہ اس نے زندگی کے گناہوں اور خطاؤں کے داغ دار دنوں میں چند دن اس طرح گزارنے کی توفیق بخش دی، جس طرح وہ چاہتا ہے کہ مومن کی پوری زندگی ہو۔ اس کی طرف سے بھلائی ہی ملتی ہے۔ وہ کس کس انداز اور کن کن طریقوں سے اپنے بندوں پر مہربان ہوتا ہے، انہیں موقع دیتا ہے، اپنی رحمتوں کے نزول کے لئے خود ہی راستے بناتا ہے، اپنے اکرام وانعام کے دروازے کھولتا ہے۔

اگرچہ دل کو اب بھی چبھن اور پچھتاوے کا احساس ستاتا ہے کہ کاش اور بہتر طریقے سے اپنی آزمائش کو جھیلا ہوتا۔ کچھ اور ڈوبتی، کچھ اور کھوتی، پھر کچھ اور پاتی۔ اللہ کی یاد کا سمندر تو بہت عمیق ہے، بڑی اتھاہ گہرائیاں لیے ہوئے ہے، اور اس میں ہر دم ڈوبا جا سکتا ہے۔ اس کی راہ میں مٹنے اور پانے کا راستہ ہر وقت کھلا ہے۔ بس ذوق جنوں اور مذاق سرفروشی چاہیے۔

جتنی فکر اور بے چینی تھی، اسی قدر اللہ کی عطا کی ہوئی راست فکری نے چین وقرار اور سکون قلب کی دولت سے دامن بھر دیا۔

پندرہویں دن نصف گھنٹے کی ملاقات ہوتی تھی، جو اس وقت کی بہت بڑی نعمت تھی۔ جیل والوں کا سلوک بھی شریفانہ تھا، ان کے ساتھ جوان کے قبضہ اختیار میں دے دیئے گئے اور ہم جانے اور ملنے والوں کے ساتھ بھی۔ لیکن میں آکر گھنٹوں سوچتی کہ انسان روٹی کے لئے کیا کچھ کرتا ہے۔ بے جان قسم کے جسم، بے روح ضمیر اور بے فکر دماغ، کیا ان کے دلوں میں کوئی کانٹا نہیں کھٹکتا۔ ان کی روحیں آخر قرار اطمینان کس چیز سے اور کس عمل سے حاصل کرتی ہیں؟ انہوں

نے اپنی ذات کو بالکل ہی بھلا دیا۔ یہ بھلانا ہی تو تھا، یہ اپنی جان پر ظلم ہی تو تھا، جس کو ان کا رب بار بار کہتا ہے کہ ظلم ہم نہیں کرتے تم خود کرتے ہو۔

کتنا عجیب اور گونا گوں قسم کا تاثر تھا، جب اخلاق، پاکیزگی اور دین کے علم بردار کو چند ٹکے کے عوض بے زبان خریدے ہوئے جسم، اپنی حفاظت میں آگے پیچھے چلتے ہوئے لے کر آتے تھے، جیسے بلندی اور پستی کا معیار ہی الٹ گیا ہو، جیسے نیکی اور بدی کے پیمانے ہی بدل گئے ہوں۔ ایک شخصیت آتی اور ہمارے سامنے بیٹھ جاتی، نگاہیں نہ معلوم کیا کچھ دیکھتیں۔ جیل کی وحشت زدہ اونچی دیواریں مجھے شرم سار نظر آتیں اور آہنی دروازے کی سلاخیں دکھ سے کراہتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ بہرحال خدا نے اپنی آزمائش سے جلد ہی نکال لیا، اگرچہ یہ پوری زندگی ہی آزمائش ہے۔ اپنے کام کی حکمتیں اور مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ ہم ہر حال میں اس کے شکر گزار ہیں۔

دل کو تقویت پہنچانے اور عزم کو تازہ رکھنے میں بہت بڑا حصہ ان خطوط کا تھا، جو مجھے ہفتے میں دو بار لکھے جاتے تھے۔ بس اتنے ہی ممکن بھی تھے۔ ان خطوں نے میری کیفیتوں کو نکھارا اور میرے احساسات کو جلا بخشی۔ بعض چیزیں اتنی پسند آتیں کہ جی چاہتا دوسروں کی نظر تک بھی پہنچا سکوں، تاکہ یہ کسی درجے میں اوروں کے لئے بھی ترغیب اور اکساہٹ کا ذریعہ بن سکیں۔ اس لیے پنی بے شمار گھریلو مصروفیتوں سے وقت نکال کر ان کو مرتب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادنیٰ ترین خدمت کو قبول کرلے اور خلوص نیت کا اجر عطا کردے۔

☆☆☆

اے میرے مالک

اے بادشاہ عالم! اے مالک الملک!
تُو جو میرا خدا ہے..... میرا آقا ہے..... میرا حاکم ہے
اور میں ..... تیری اک ادنیٰ سی بندی..... معمولی غلام..... اک پیکرِ خاکی..... محض خاک..... تیرے لئے میرے احساسات.....؟ جانے کیوں قلم رُک رُک جاتا ہے..... میرے ہاتھ کپکپائے جا رہے ہیں..... اس لئے نہیں رب بصیر وعلیم! کہ میرے پاس تیرے لیے الفاظ نہیں..... اس لئے نہیں کہ تیرا عنایت کیا ہوا دل احساسات سے عاری ہے.....
بلکہ اس لئے..... اے رب العرش العظیم کہ کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ!
لیکن اگر یہ تیرا حکم ہے تو۔ تُو اس کو پورا کروانے پر بھی قادر ہے..... اور ہوگا کیوں نہ..... تُو ..... کائنات کے ذرے ذرے پر حکمران ہے۔
تیری رحمت ..... کل عالم انس وجان پہ سایہ فگن .....
تیرا نور..... ہماری تاریک دنیا میں اجالا
جس کو تو نے دیدہ بینا بخشا..... اس نے تجھے ہر ہر طرف پایا
جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا
تُو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
نیلگوں فلک..... سرمئی چادر اوڑھے آنکھ مچولی کھیلتی گھٹائیں
یہ جلتے بجھتے دیے..... روشنیوں کا حسین امتزاج
یہ عکس در عکس پھیلے..... تیرے جلوے ہی تو ہیں!
یہ سرسبز مخملی فرش، اس پر ضوفشاں شبنمی قطرے.....
یہ لہراتی بل کھاتی شفاف ندیاں..... اے میرے لطیف وکریم! یہ سب تیرے حسن کا پرتو ہی تو ہیں۔
مغرب کے وقت جب سورج کی کرنیں اپنا وجود سمیٹ رہی ہوتی ہیں..... آفتاب کی چمک دھیرے دھیرے رات کی سیاہ زلفوں سے بدلنے لگتی ہے
تو اے کارسازِ حقیقی! رات اور دن کے اس سنگم پر..... تیرا وجود نظر آتا ہے۔
آسمان کی طرف نگاہ اٹھا بھی نہیں پاتی کہ چاروں اور سے صدا آنے لگتی ہے
''اللہ اکبر..... اللہ اکبر''
وہ تیرے مقرر کردہ پکارنے والوں کی آواز.....
اور ..... (اگر تو دل کی آنکھیں دے دے تو)..... یہ نگر نگر گانے والے..... اونچی سُریں الاپنے

والے چہچہاتے مسکراتے..... نغمۂ حمد وثنا گاتے..... تیرے طائرخوش الحان بھی تیرے موذن ہی تو ہیں۔انہیں دیکھتی ہوں تو تیرے وجود کا احساس اپنے قریب بہت قریب ہوتا ہے اور کیسے نہ ہو..... یہ سب کچھ تو تُو نے انسان کی خاطر..... میری خاطر تخلیق کیا اور یہ تیری مدد کے بنا کچھ بھی حاصل کرنے پہ قادر نہیں۔تو ہمہ وقت اس کی نگرانی کرتا ہے..... پرورش کرتا ہے..... کھلاتا ہے..... اڑاتا ہے..... پھر میرے قریب کیسے نہ ہوگا..... میں تو اشرف المخلوقات ہوں..... تیری نائب ہوں!

تو میرے کس قدر قریب ہوگا..... اُف یہ احساسِ قربت کتنا پیارا..... کتنا خوش کن، کتنا حسین..... کتنا مسحور کن ہے..... کہ میرا آقا..... میرا مالک..... مجھ سے اتنا قریب کہ رگ جان بھی دور ہے.....

میں اس احساس میں سرشار ہوئی چلی جاتی ہوں..... ہوئی چلی جاتی ہوں..... چاہتی ہوں کہ اس کیف میں ایسے ڈوبوں کہ کبھی ابھر نہ سکوں لیکن تبھی اک احساس اٹھتا ہے .....خبر دار! خبر دار! میں تیرے قریب ہی نہیں، تیرا رقیب بھی ہوں..... تیری رگ رگ سے واقف..... علیم وبصیر ہوں..... تیری اک اک سوچ اک اک عمل سے باخبر.....تو نے خود کو میرا نائب مانا ہے، میں جانتا ہوں کہ تو نے زبان سے اقرار کیا ہے یا دل سے..... میں جانتا ہوں کہ تو میری نیابت کر رہی ہے یا نہیں..... مجھے معلوم ہے میرا حق کس قدر ادا کر رہی ہے.....

یہ احساس..... یہ آوازِ غیبی میرے وجود کو تھرا دیتی ہے۔میں کانپ اٹھتی ہوں، اس لیے.....اس لیے کہ میرا رب ''قہار وجبار'' بھی ہے، حسیب وجلیل بھی ہے!

آج وہ میرے احساس کے ذریعے مجھ سے مخاطب ہے.....کل مجھے اس کی عدالت میں کھڑا ہونا پڑے گا۔وہ منعم اور رزاق اک اک شے کا حساب لے گا۔اس ہر ہر لمحے کا حساب جو اس نے مجھے دیا ہے۔ تب جانے کیوں میں اپنے احساس سے نظریں چرانے لگتی ہوں..... جیسے میں مجرم ہوں..... جیسے میں نے کسی کا حق مارا ہو..... کہیں سے صدا آتی ہے، رب رحمٰن ورحیم ہے۔تو آزردہ کیوں ہے؟ وہ جس نے دنیا میں تجھے ہر ہر نعمت سے نوازا ہے، کیا عالم بالا میں تیرا معاون نہ ہوگا؟ وہ تجھ سے محبت کرتا ہے.....اس لیے کہ تو اس کی تخلیق ہے، خالق کو اپنی تخلیق بہت محبوب ہوتی ہے.....تو آہستہ آہستہ میری امیدیں پھر سے استوار ہونے لگتی ہیں.....من کچھ مطمئن سا ہونے لگتا ہے۔

تو اک اور احساس کروٹ لے کر بیدار ہوتا ہے۔ تخلیق جب خالق کے اصولوں پر نہ چلے تو خالق کو اس سے اُنس چہ معنی؟

اس وقت .....اے رب بصیر وعلیم اپنی اصلیت کا احساس ہوتا ہے.....اے علی الکبیر! میں تیری مٹھی میں بے بس ہوں..... بالکل بے بس..... پھر..... یہ گمان

عز و جاہ کیا؟ متکبر تو تُو ہے..... اور یہ تجھی کو سزاوار ہے کہ تو اس وسیع و عریض کائنات..... اپنی بے حد و حساب تخلیقات پہ تفاخر کرے۔ مگر..... ہم ترے خاکی بندے..... مٹی سے پروردہ..... سرکش ہوتے جا رہے ہیں..... دلوں کی سیاہیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

تہہ بہ تہہ تیرگیاں ذہن پہ جب ٹوٹتی ہیں
نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہویدا تیرا

ایسے میں تیرا قرب ایک مضبوط سہارے کی طرح دل کی ساری کرچیاں سمیٹ لیتا ہے۔

سارے آنسو پونچھ دیتا ہے..... بڑے ہی پیار سے آواز آتی ہے۔

وکفی باللہ ولی وکفی باللہ نصیرا

''میں جو تیرا دوست ہوں..... تیرا ہوں..... تیر امددگار ہوں!

کیا ہوا جو کوئی التفات نہیں کرتا..... کیا ہوا جو لوگ بے رخی برتتے ہیں..... تو مجھ سے دل لگا کر تو دیکھ..... کبھی تیرا دل نہیں توڑوں گا..... کبھی تجھ سے بے رخی نہیں برتوں گا۔ تو میری باتوں کا اعتبار تو کر میری پیاری بندی.....!''

اس وقت بے اختیار سر خاک پر رکھ دینے کو جی چاہتا ہے..... بے اختیار جھک جانے کو جی چاہتا ہے..... اس کے حضور جس کی محبت لازوال ہے..... اس کے حضور جس کا التفات ابدی ہے..... جو الولی الحمید ہے..... جو رحیم و کریم ہے۔

جو ساری دنیا کا ہو کر بھی اپنا ہے۔

اپنا..... یہ احساس کتنا پیارا ہے۔

مجھے یاد ہے وہ دن..... جب بازار سے گزرتے ہوئے میلے کچیلے کپڑوں والی بھکارن نے اپنا کشکول آگے پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔

''بی بی! اپنے اللہ! کے نام پہ کچھ دے دو.....''

میں نے بے خیالی میں چند سکے نکال کر اس کی طرف اچھال دیے..... لیکن..... جب اس کے الفاظ کی قیمت کا اندازہ ہوا تو میرا جی چاہا کہ اسے پھر سے آواز دوں..... اور سارے پیسے اس کے کشکول میں ڈال دوں اگر وہ پھر سے اک بار کہہ دے.....

''بی بی! اپنے اللہ کے نام پہ کچھ دے دو.....''

لیکن وہ بھیڑ میں گم ہو گئی..... مجھے اک میٹھا سا احساس دے کر..... اک خمار سا میرے احساسات پر چھوڑ کر..... بے شک اللہ ہے تو ہمیشہ سے اپنا..... لیکن..... اس کا احساس کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔ اور.....

اے میرے خبیر اللہ! تُو دل میں اٹھنے والے اک اک جذبے..... اک اک احساس سے باخبر ہے۔ تو جانتا ہے ہمارے دلوں میں کیا کیا احساسات ہیں۔ لیکن تو نے تو خود ہی بتا دیا کہ ہم تیرے بارے میں کیا سوچیں کس طرح سوچیں..... تو نے بتا دیا تو کیسا ہے..... تو نے بتا دیا ہم تجھے کس طرح پکاریں..... اور یقیناً وہی احساس بہترین ہیں جن کی بنیاد پر تیرا اپنا تعارف ہے۔ بے شک تجھے علم ہے..... کس نے اس

بہترین احساس سے کتنا حصہ پایا۔
وماتوفیقی الا باللہ

28 جون 1979
فاطمہ جناح میڈیکل کالج ہاسٹل۔لاہور

☆☆☆

مرسی کے ''بھیانک جرائم''

مرسی کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد پوری دنیا کو کوئی ''مسری'' تو کھلائی نہیں تھی کہ انہیں ''معاف'' کردیا جاتا اور ان کی شان میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہوئے انہیں امن کا ''نوبل'' اور جمہوریت کا ''فروبل'' ایوارڈ عطا کیا جاتا..... عجیب ''بنیاد پرست'' ہے یہ شخص، اپنے نبی ﷺ اور دین سے بے پناہ محبت کرتا ہے، اس کی دیدہ دلیری تو ملاحظہ فرمایئے کہ بھری بزم میں دشمنانِ مصطفیٰؐ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے کہ ''گستاخان رسولؐ کو معاف نہیں کیا جاسکتا، ناموس رسالتؐ کا بین الاقوامی قانون بنانا پڑے گا، کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمارے نبیؐ کی شانِ ارفع واعلیٰ میں ادنیٰ سی بھی توہین کا ارتکاب کرے، ہم ایسے دریدہ دہن غلیظوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔''..... پھر یہ ''اخوانی خون'' یہیں پر بس نہیں کرتا بلکہ اعلانیہ دنیا بھر کے مسلم ممالک کی اخلاقی اور حربی مدد کے لئے بھی کمربستہ ہے..... نبی کریمؐ کے اولین معاہدے ''حلفِ الفضول'' کے اصولوں کی روشنی میں اس نے ڈرے بغیر عالمی سامراج کو یہ پیغام دے دیا تھا کہ ''ہم مظلوموں کی مدد کے لئے ہر قسم کی قوت بروے کار لائیں گے، اسلامی ممالک میں جہاں جہاں ظلم ہوگا اور اگر بیرونی قوتیں مداخلت کریں گی تو ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔''..... اسی مرسی نے کرسی کو خاطر میں لائے بغیر اسرائیل کو متنبہ کیا تھا کہ ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام میں روڑے اٹکانے کے بجائے اپنی ''ناجائز تعمیرات'' کو منہدم کرنا سیکھے..... مصر کا یہ زیرک حراست صدر نہ جانے کتنی مدتوں سے عشقِ رسولؐ میں گرفتار رہے۔ جب ہی تو اس نے شب خرابی کے تمام مراکز یعنی نائٹ کلبز اور مے خانوں پر پابندی لگانے کے انتہائی اقدام سے بھی گریز نہیں کیا..... شرم الشیخ میں جہاں واقعی کسی بھی ''اصل شیخ'' کو شرم آجائے اس ضدی سربراہ نے ایسی ایسی پابندیاں لگائیں کہ عیاش تلملا اٹھے، اہرام سے فرعونی ارواح کی نہ رکنے والی چیخ وپکار کے سبب پورا مصر لرز اٹھا اور رنگین راتوں میں بے حیائی کا رنگ ماند پڑ جانے سے دادِ عیش دینے لینے والوں کو ہی لینے کے دینے پڑ گئے..... بھلا اتنے سنگین اور ''اخلاقی جرائم'' میں ملوث شخص کو کیسے بخشا جاسکتا تھا؟ جمہوریت کو اپنی پہلوٹی کی اولاد قرار دینے والے ممالک کی نیندیں حرام ہوچکی تھیں، رہبران جمہوریت غم غلط کرنے کے لئے

ہوائی میں چھٹیاں گزارنے کے باوجود اپنی ہوائیوں کو اڑنے سے نہیں بچا سکے اور ان کے ''مسلم ہمنواؤں'' کو جب تاج اچھلتا اور تخت گرتا محسوس ہوا تو سب ایک ہی صفحے پر ''یک سطری تحریر'' بن گئے کہ ''مرسی سے جان چھڑاؤ، مرسی کو کرسی سے ہٹاؤ''.....اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے، ظاہراً تو وہ مظاہرے تھے مگر درحقیقت ''پرکشش مشاہرے'' تھے جنہیں انڈیلنے اور درہم و دینار میں کھیلنے کے شوق میں بے چین تحریر اسکوائر پر چیونٹیوں کی طرح نکل آئے، شور مچتا رہا، نعرے لگتے رہے، جھڑپیں یقینی تھیں سو وہ بھی ہوئیں اور پھر پردہ سمیں سے وہی چہرہ نکلا جو ہمارے ہاں بھٹو اور میاں صاحب کے سامنے نکلا تھا.....یعنی ''تینوں'' کی پسند کا آرمی چیف کا راگ پرانا تھا، آواز نئی، ساز وہی تھے بس سوار مختلف ملک وقوم کے عظیم تر مفاد اور جمہوریت کی خاطر بالآخر مصر بھی کچھ دیر کے لئے پاکستان بن گیا اور مرسی صاحب نے جسے جمہوریت کے حق میں سیسہ پلائی دیوار سمجھا تھا وہ جنرل سیسی اپنے آقا کے حکم کو وفاداری سے بجالایا..... پہلے مرسی رکنے کو تیار نہ تھے پھر جھکنے پر آمادہ نہ ہوئے لہٰذا انجام بھی واضح تھا یعنی اسیری۔

مجھے حیرت تو اس پر ہے کہ کچھ روز پہلے تک دنیا کو مرسی کے خلاف عوام کا جم غفیر ایک ''فیصلہ'' نظر آ رہا تھا مگر اب مرسی کی حمایت میں لاکھوں انسانوں کا دریائے نیل دکھائی نہیں دے رہا.....مرسی صاحب کے منصب پر قابض ''ضروری صدر'' جنہیں پیار سے سب ''عبوری'' کہہ کر پکارتے ہیں دراصل سبتی (Adventist) فرقے کے ''چھپے رستم'' ہیں..... عدلی منصور اپنے پیارے اسرائیل کا چہیتا ہی نہیں بلکہ سازشی منصوبے کا ایک کامیاب ''نتیجہ'' بھی ہے..... تاریخ کی ناقابلِ تردید حقیقت کے مطابق قبطی (Coptic) مسیحی امریکہ سے مصر آ کر بسنے والے سبتیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں کیونکہ سبتی سر سے دھڑ تک یہودی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مسیحی کہتے ہیں اور قبطی مسیحی انہیں ''مسیح اللہ'' کا پیروکار ماننے کے لئے تیار نہیں، امریکہ کا راج دلارا عدلی منصور اس فرقے سے تعلق رکھتا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کو (معاذ اللہ) اللہ کا بیٹا مانتے ہیں لیکن اتوار کے بجائے ہفتے کے دن کا احترام کرتے ہیں یعنی یہ مسیحیت اور یہودیت کا ایک ایسا ملغوبہ ہے جو 1831ء میں اس وقت معرض وجود میں آیا جب امریکہ میں ولیم ملیر نامی ایک شخص کو جھوٹے نبیوں کی طرح وحی آنے لگی گو کہ اس نے مسیح ہونے کا دعویٰ نہیں کیا مگر اپنی ذات کو مسیح اللہ کا پرتو قرار دیا اور سبت کے دن کو اتوار پر مقدم ٹھہرایا.....شروع میں ان سبتیوں کو ''ملیری'' کے نام سے پکارا جانے لگا.....اس سے پہلے ان خودساختہ مسیحی ''سبتیوں'' کو کوئی جانتا تک نہ تھا اور اسی بنا پر قبطی انہیں مسیحی نہیں بلکہ یہودی قرار دیتے ہیں..... چنانچہ اب یہی کہنا بہتر ہوگا کہ مصر کے منصب صدارت پر ایک مسلمان نہیں بلکہ

یہودی فائز ہے اور ظاہر ہے کہ اسرائیل کے لئے یہ ایک آئیڈیل صورتحال ہے..... مصر میں مسلمانوں کے بعد اکثریتی فرقہ قبطیوں کا ہے جنہوں نے مذہب کی بنیاد پر محمد مرسی کی حمایت تو نہیں کی مگر کھل کر مخالفت بھی نہیں کی..... میں قبطیوں کا وکیل نہیں اور نہ ہی ان کے نظریات کا حامی ہوسکتا ہوں لیکن سرورکون ومکاںؐ کی ایک زوجہ مطہرہ جن کے بطن سے حضرت ابراہیمؓ کی ولادت ہوئی وہ مصری قبطیہ تھیں جنہیں ہم حضرت ماریہ قبطیہؓ کے نامِ اقدس سے جانتے اور احترام کرتے ہیں اور شاید اسی سبب میں قبطیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں..... مگر کیا کہوں کہ آقاؐ کے قلبِ اطہر پر اترنے والے قرآن نے ہمیشہ ہماری فکروں اور اندازوں کو غلط قرار دیا..... ایک دوسرے سے نفرت کے باوجود قرآن کا فیصلہ ہے کہ (مفہوماً عرض کرتا ہوں) ''ہمارے پیارے! آپ یہود و نصاریٰ کو مسلم دشمنی میں ایک پائیں گے۔''.....اور آج مصر میں سیتوں سے شدید عداوت کے اظہار میں 322 سے زائد کتابیں اور کتابچے چھاپنے اور تقسیم کرنے والے قبطی، عدلی منصور اور البرادعی کی حمایت میں سگی ماں کی طرح اخوان المسلمین پر چلّا رہے ہیں..... کلام الٰہی میں امثال کی منظر کشی صرف تصورات ہی میں ممکن نہیں، ذرا غور فرمایئے تو آنکھوں کے سامنے لاتعداد مناظر امتیوں کو دعوتِ فکر دیتے نظر آتے ہیں.....کل البرادعی کو وزیراعظم مقرر کروا کے یہود و نصاریٰ نے ایک فیصلہ سنایا ہے کہ'' اسلام دشمنی میں ہم ایک دوسرے کے ہمیشہ حامی و مددگار رہیں گے چاہے ہمارے درمیان لاکھ اختلافات ہی کیوں نہ ہوں۔'' اور بعض مسلم ممالک نے ''خیر مقدم'' کے ذریعے انہیں یہ جواب دیا ہے کہ ''ہم ہمیشہ قرآن پڑھتے رہیں گے لیکن اس پر عمل نہیں کریں گے چاہے ہمیں موت ہی کیوں نہ آجائے''.....!!!

(روزنامہ جنگ لاہور۔ ۷ جولائی ۱۳ء)

☆☆☆

چلو کہ منزل بلا رہی ہے

حفصہ محمد افضال

جھگیوں میں رہنے والے خانہ بدوشوں کی زندگی، اپنی تمام تر تلخیوں سمیت بہت تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ اس قدر تکلیف دہ ہوتی نہیں کہ نیلے آسمان کی چھت تلے آنکھ کھولنے والے نومولود کے محدود ذہن کے کینوس پر فقط اتنے ہی رنگ بکھرتے ہیں جتنے دیدۂ بینا دیکھ پاتا ہے۔ اس کے پاس اسکیچ بنانے کو نہایت محدود مناظر ہوتے ہیں چنانچہ تصورات کی دنیا بھی اسی قدر محدود ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس شاہی محل میں آنکھ کھولنے والا بچہ جو ست رنگی دنیاؤں کا باسی ہو، اس کے ذہن کا کینوس بھی اسی قدر بڑا ہوگا۔ ایسے میں اگر ہم اچانک ہی کسی لمحے اس کے ذہن کو محدود کرتے ہوئے اس کے کینوس کو چھوٹا کرنا چاہیں تو یہ نہ صرف کٹھن ہوگا بلکہ کسی حد تک ناممکن بھی.....

شاہی محل میں پلنے والے نومولود جیسا ہی حال میرے اسلاف کا بھی تھا۔ وہ بھی ست رنگی دنیاؤں کے مالک تھے۔ الحمرا کے سر بفلک افق کی پیشانی کو بوسہ دیتے میناران کی عظمتوں کا شاہکار تھے تو غرناطہ جیسے عظیم شہران کی بڑائی کے امین..... وہ جب نکلتے تھے تو سر پہ کفن باندھ کر، راستوں کی مشکلات کی پروا کیے بغیر، سمندروں کا سینہ چیرتے چلے جاتے تھے۔ وہ ہواؤں کو مسخر کر لینے کے فن سے بھی آشنا تھے۔ قیصر و کسریٰ کے مضبوط محل ان کے سامنے خس و خاشاک سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

ایسی دنیا کے مکین کو جب محل سے اٹھا کر ہندوستان کی جھگی میں لا پھینکا گیا تو یقیناً سانس تک لینا دشوار ہو گیا ہوگا کہ حکمرانی سے فقیری تک کا سفر بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے سات آسمانوں سے محدود زمین تک کا، جیسے ہر دم آزادی سے نیلے آسمان پر اڑان بھرتے پرندے کے پر کاٹ دینا، جیسے خزاں آئے اور بہار رتوں کے سارے رنگ نوچ ڈالے..... اور جھگی بھی ایسی جس پہ جگہ جگہ ذلت و حقارت کے پیوند لگے تھے۔ جسے نفرت کے بانسوں پہ اٹھایا گیا تھا اور جس کی زمین کو گیتا کے اصولوں کی ردا سے ڈھکا گیا تھا۔ جو بس انھیں اپنے دامن میں پناہ دیتی تھی جو اس کی حقانیت کو تسلیم کرتے تھے اور جو منکر ہوتے ان کے لیے کیکٹس کے پودے سے بھی زیادہ پرخار بن جاتی۔

جاہلانہ ریتوں رواجوں کی تعفن زدہ فضا میں تو سانس بھی گھٹ گھٹ کر آتا ہے، زندہ رہنے کی خواہش

بھی دم توڑ جاتی ہے، جی اندر سے مر جاتا ہے، زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنا جوئے شیر لانے کے مترادف لگتا ہے کجا یہ کہ دوڑ میں حصہ لے لیا جائے .....لیکن میرے اسلاف نے ایسا بھی کیا۔ انھوں نے دوڑ میں حصہ لینے کو بہتر خیال کیا۔ افق کی پیشانی پہ لکھا ''چلو کہ منزل بلا رہی ہے'' کا جذبوں کو جوش دلاتا، منزل کی جانب پکارتا نعرہ، اس قدر روشن تھا کہ اس کے سامنے جھگی کی تیرگی اپنا آپ ہار گئی۔ نعرے نے گاڑی کے پٹرول کا کام دیا اور پھر انسانوں کی بستی سے لے کر آکاش کے باسیوں تک نے وہ منظر دیکھا جب تحریک آزادی نمو پائی اور تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت وقوع پذیر ہوئی ..... گو وہ ہجرت خون میں لتھڑی ہوئی تھی لیکن آزادی حاصل کرنے کی لگن نے پنچھی سے پنجرے کی مضبوط سلاخیں کتروا ڈالیں اور قربانیوں کے لال آنچل تلے میرے اسلاف نے دھرتی ماں کی سرحد کو عبور کیا۔

کہیں بنتِ حوا نے اپنے اجلے دامن پہ سیاہی ملنے کی بجائے موت کے جام کو جاں فزا خیال کیا تو کہیں ماؤں نے اپنے جگر گوشوں کو رات کی تنہائی کے سپرد کر دیا۔ نجانے کتنے برس میرے وطن کے گلی کوچوں نے مخبوط الحواس ماؤں کے ساتھ لپٹ کر بین کیا اور نجانے کتنی سہاگنوں نے چند دن قبل بھری مانگ کو اپنے ہاتھوں سے اجاڑ ڈالا ..... کیونکہ ..... کیونکہ منزل کی جانب پکارتی آواز صداقتوں سے بھرپور تھی۔ معطر فضائیں تعفن سے پاک تھیں اور پاکیزہ زمین کی باس گولہو کی خوشبو میں رچی ہوئی تھی مگر خساروں کی کاٹ سے آزاد تھی۔

ہمت و لگن نے حضرت انسان سے وہ کروا لیا جو دیوانے کا خواب لگا کرتا تھا اور جسے محض شاعر کا خیال کہا جاتا تھا۔

کام، کام اور کام کی تکرار جب دل کی دھڑکن بن جاتی ہے تو منزل خود جھک کر قدم بوسی کیا کرتی ہے۔ ایمان، یقین اور تنظیم جیسے معقولے جب لہو بن کر جسم میں گردش کرنے لگتے ہیں تو بڑے سے بڑا معرکہ سر ہو جاتا ہے۔ جب منزل خود بنی نوع انسان کو پکارنے لگتی ہے تو تاریخ گواہ ہے کہ ایک عرصے کے تاریک پڑے آسماں بقعہ نور بن جایا کرتے ہیں۔ اور یہی وہ نعرہ ہے جو خون منجمد کر دینے والی فضاؤں میں لہو گرما دیتا ہے اور آنکھوں کے تاریک پڑے گڑھوں میں بہت سے جگنو بھر دیتا ہے۔

گزرے پینسٹھ برسوں سے لے کر موجودہ زمانے تک یہ پکار ایک ریت بن گئی ہے اور اپنے صبیح چہرے کی طرف متوجہ کرنا منزل کی حسین عادت ..... گزرے پینسٹھ برسوں میں مختلف ادوار، مختلف زمانوں اور مختلف موسموں کی بدلتی رتوں میں یہ وطن کے جیالے بیٹوں کو پکارتی رہی ہے۔ اس کی پکار پہ کان دھرے تو میجر عزیز بھٹی کے شہید لاشے پہ ستارۂ امتیاز سجا اور اس کے بلاوے پہ لبیک کہتے ہوئے شیر جواں راشد منہاس نے فضاؤں کے سینے پہ ستارۂ جرأت سجایا۔ یہ آج بھی اسی

تواتر سے وطن کے بیٹوں کو پکارتی ہے۔غور سے سننے پہ ہمہ وقت کہیں دور سے دھیمی سی سرگوشی ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔منزل کی سرگوشی.....فضاؤں کے دوش پہ لہراتا یہ پر کیف نعرہ ''چلو کہ منزل بلا رہی ہے'' مجاہدین اسلام کے کانوں میں رس گھولتا رہتا ہے۔

☆☆☆

وقتِ دعا ہے!

عصمت اسامہ حامدی

امت مسلمہ آج شدید آزمائشوں اور کٹھن حالات سے دوچار ہے۔ جا بجا جنگوں کی بھڑکتی آگ ہے۔ امت زخمی ہے،لہولہو ہے۔دربدر ہے لیکن ملی وحدت اور مشترکہ لائحہ عمل کہیں نظر نہیں آتا۔موجودہ دور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور کہلاتا ہے۔ دنیا بھر کی خبریں اور اطلاعات منٹوں اور سیکنڈوں میں میلوں کا سفر طے کر رہی ہیں لیکن مسلم دنیا پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، عالمی میڈیا پر ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ برما اور شام دو مسلم ممالک اسی کرۂ ارض پر واقع ہیں لیکن وہاں بیتنے والے قیامت کے مناظر کو دیدہ و دانستہ چھپایا جا رہا ہے یا بہت کم حصہ دنیا کے سامنے لایا جا رہا ہے۔ برما میں بدھسٹ حکومت کی سربراہی میں روہنگیا مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔اجتماعی قتل اور املاک کی آتش زنی سے مجبور ہو کر لاکھوں مسلمان نقل مکانی کر چکے ہیں اور اکثریت نے جن علاقوں میں پناہ لی ہے وہ سیلاب زدہ ہیں۔ برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر کو عینی شاہدین نے بتایا کہ مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ گھروں میں محصور ہو جائیں۔ جب وہ اپنے گھروں میں بند ہو گئے تو بدھوں نے ان کے گھروں کو آگ لگانا شروع کر دی، وہ تپش سے گھبرا کر باہر نکلے تو بلوائیوں اور پولیس دونوں نے ان پر گولیوں کی بارش کر دی۔مسلم آبادی والا علاقہ ''کیاوکبو'' مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا گیا۔''امت رپورٹ'' کے مطابق پانچ ہزار مسلمان عقوبت خانوں میں قید ہیں جنھیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور دنیا برمی مسلمانوں کی طرف سے اندھی بہری گونگی بنی ہوئی ہے۔

اس سے زیادہ پریشان کن صورت حال، تیل کی دولت سے مالا مال،سٹریٹجک اہمیت کے حامل ملک شام کی ہے۔ شام کی کل آبادی ساڑھے بائیس ملین ہے جس میں سے نصف آبادی کی خوراک کا انحصار اس وقت صرف امدادی اداروں پر ہے۔ایک تہائی آبادی نقل مکانی کر چکی ہے۔ شام کے شہر ''القصیر'' میں خوفناک جنگ جاری ہے۔ یہاں چھ سو سے زائد افراد زخمی حالت میں پڑے سسک رہے ہیں جنھیں کوئی طبی امداد بھی میسر نہیں آ سکی۔زندگی کے ٹمٹماتے چراغ بجھنے کے قریب منتظر ہیں کہ کوئی ہوا کا جھونکا آئے۔ عالمی انسانی حقوق کمیشن کی رپورٹ کے مطابق شام میں قتل ہونے والے شہریوں کی تعداد سوا لاکھ ہے۔ان فرزندانِ توحید کو جس طرح بربریت سے ذبح کیا گیا اور زندہ جلایا گیا،ان کی تفصیلات لکھنے سے یہ قلم عاجز ہے۔ برطانوی

جریدہ ڈیلی ٹیلی گراف کی رپورٹ کے مطابق شام میں شہری آبادی پر کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ایسے بم پھینکے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے انسانوں کو سانس لینے میں شدید تکلیف ہوتی ہے اور جسمانی خلیوں کے تیزی سے گلنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

اے خاصہ خاصانِ رسلؐ وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے!

شام میں عصر حاضر کی کربلا برپا ہے مگر کوئی ایسا میڈیا موجود نہیں جو دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات کی خبر رکھے۔ دوسری طرف ایسے ''امدادی اداروں''(Disaster Control Unit) کی اشد ضرورت ہے جو مسلم دنیا کے مصائب میں ان کی مدد کو پہنچیں۔ جو طبی سامان، فرسٹ ایڈ، خیمے، خوراک اور لباس کی فراہمی ممکن بنا سکیں۔ اوآئی سی اور انجمن ہلال احمر جیسے اداروں کو فعال کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں، عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے، کفار کی قید میں جو مسلمان مرد و خواتین موجود ہیں، ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

رواں مہینے، ڈاکٹر عافیہ صدیقی جیسی مایۂ ناز پی ایچ ڈی ڈاکٹر پر امریکی جیل میں حملہ کر کے لہولہان کر دیا گیا اور دو دن تک کوئی طبی امداد بھی فراہم نہ کی گئی وہاں نہ ہی کسی کو حقوق نسواں یاد آ سکے۔ نہ ہماری طرح کسی کو سرکاری سطح پر Soft Image کی کوئی فکر ہوئی۔

اسی طرح بھارتی قید میں پاکستانی ثناء اللہ پر حملہ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا (جس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ غلطی سے سرحد پار کر کے بھارت چلا گیا تھا اور پندرہ سال سے جیل میں بند تھا) لیکن بھارت میں اس وقت کسی کو ''امن کی آشا'' کی یاد تک نہ آئی۔ دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں کو تعذیب و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ایسے قیدیوں کو رہا کروانے اور عالمی عدالت انصاف میں مقدمہ لڑنے کے لیے مسلم وکیلوں اور قانونی ماہرین کی بھی کوئی عالمی تنظیم ہونی چاہیے جو رضا کارانہ طور پر ایسے مقدمے لڑ سکے۔

قارئین، اب تو سوچنے کا وقت بھی لگتا ہے کہ ختم ہو چلا ہے۔ مسلم دنیا کے دانشوروں اور مفکرین کو خود آگے بڑھنا چاہیے۔ ایسے نیٹ ورک تشکیل دینے چاہئیں جو رضا کارانہ طور پر امت مسلمہ کو مصائب سے نکالنے کا علمی طریقہ وضع کر سکیں۔ ہم مسلمان ایک ہیں اگر ہم یہ حقیقت جان کر اسی جذبہ اخوت کی طرف لوٹ آئیں جو ہمارے اسلاف میں پایا جاتا تھا تو ہماری یہ کمزوری بھی قوت میں بدل سکتی ہے۔ ہم سب حضور اکرمؐ کے امتی ہیں، ہمیں ایک دوسرے کا غم خوار ہونا چاہیے۔

☆☆☆

بیگم خورشید نیازی سے ایک ملاقات

بیگم خورشید نیازی پاکستان میں سماجی بہبود کے لیے کام کرنے والوں میں ممتاز حیثیت کی حامل ہیں۔ آپ دبلی پتلی، نازک سی دھیمے لہجے میں بات چیت کرنے والی خاتون ہیں۔ آپ نے متعدد سماجی بہبود کی تنظیموں کے ساتھ کام کیا۔ پاکستان گرل گائیڈ ان کی پہچان رہی۔ انھوں نے بیگم جی اے خان کی سیکرٹری کے طور پر اپنے فرائض انجام دیے۔ پچھلے دو سالوں سے بستر علالت پر ہیں مگر ابھی بھی سماجی میٹنگز میں وہیل چیئر پر بیٹھ کر جاتی ہیں اوران میں بھرپور شرکت کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی معذوری کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ ان کی زندگی کا مقصد پاکستان کی خدمت اور ''کام کام اور بس کام'' رہا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ انیس برس کی تھیں۔ قائداعظم کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا اور محترمہ فاطمہ جناح سے بھی ملاقاتیں رہیں۔

آیئے ان سے ملتے ہیں۔ ہماری گفتگو میں محترمہ گل رعنا مسعود صاحبہ بھی شریک تھیں جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

س: اپنا سن پیدائش بتائیں گی؟ اور کچھ خاندانی پس منظر بھی۔

ج: ۱۹۲۸ء میں میری پیدائش ہوئی۔ ہم لوگ میانوالی کے رہنے والے ہیں۔ میرے والد کا نام غلام محمد خان تھا، کوآپریٹو سوسائٹی میں ملازمت کرتے تھے۔ میرے والد چار بھائی تھے، سبھی گریجوایٹ اور سرکاری ملازم۔ ہمارے گھر کے سبھی افراد تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ والد کی پوسٹنگ دوسرے شہروں میں ہوتی رہتی تھی۔ ہم ان کے ساتھ جس شہر بھی جاتے، تعلیم پر زور رہتا۔

س: گھریلو ماحول کیسا تھا؟

ج: ہمارے گھر میں کسی پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہر کسی کو ہر طرح کی آزادی تھی حتیٰ کہ لڑکیوں کو بھی۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ میری بڑی آپا کا نام صفیہ تھا وہ سیاسی گھرانے میں بیاہی گئیں۔ امیر عبداللہ خان روکھڑی ان کے شوہر تھے۔ وہ بارہ سال سینیٹر رہے، مسلم لیگ کے نمائندہ تھے۔ ہر طرح کی آزادی کے باوجود میں ہمیشہ وہی کرتی جو بڑے کہتے تھے۔ آزادی کا غلط فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہماری تربیت میں امی کا کردار نمایاں رہا، آزادی کے باوجود جن کی کڑی نگرانی میں ہم ہمیشہ رہے۔

س: شادی کب ہوئی۔

ج: رسمی سی شادی تھی۔ شوہر میرے کزن تھے۔ جلد علیحدگی ہوگئی اور پھر مجھے کام کرنے کی آزادی مل گئی۔

س: پاکستان گرل گائیڈ کیسے اور کب جوائن کی؟ نیز اپنی تعلیم کے بارے میں بتائیں؟

ج: بیگم خدیجہ اے خان نے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو گرل گائیڈ کی بنیاد رکھی۔ قائداعظم کے ایما پر اس کام کا آغاز ہوا۔ انھوں نے بیگم جی اے خان کو جو اس وقت صوبہ پنجاب کی صوبائی کشمنر تھیں، بلا کر عالمی گرل گائیڈ کا کام نوزائیدہ مملکت پاکستان میں شروع کرنے کو کہا کیونکہ تقسیم ہند سے پہلے یہاں گرل گائیڈ کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ چنانچہ محترمہ فاطمہ جناح کی سرپرستی اور بیگم جی اے خان کی نگرانی میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ میری عمر اس وقت ۱۹ برس تھی۔

ان دنوں والد کی پوسٹنگ پشاور میں تھی اور میں پشاور کے ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھتی تھی وہیں سے میں نے گریجوایشن بھی کی۔ بیگم جی اے خان لدھیانہ کی رہنے والی تھیں وہ گرل گائیڈ کی پاکستان میں ابتدا کرنے والوں میں سے تھیں۔ بعد میں انھوں نے الیکشن بھی لڑا۔

س: بچپن کی کوئی باتیں یاد ہوں؟

ج: باتیں بہت سی ہیں۔ ہمیں ہر مثبت سرگرمی پر گھر سے حوصلہ افزائی ملتی تھی۔ میں کسی کو دکھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے والدین کے اعتماد کو برقرار رکھا۔ میری گرل گائیڈ میں شرکت پر بھی گھر میں سب نے بہت انکرج کیا۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

س: پاکستان گرل گائیڈ میں کیا خاص بات تھی جس نے آپ کو متاثر کیا اور آپ اس میں شامل ہوئیں؟

ج: خدمت کرنے کا جذبہ، سپرٹ آف گرل گائیڈ جس نے مجھے اس میں شامل کیا۔ آج کل سپرٹ کے معنی بدل گئے ہیں۔ اب پہلے جیسے لوگ بھی نہیں رہے اور ماحول بھی نہیں رہا۔

س: آپ نے کتنے عرصے اس میں کام کیا اور کس عہدے پر رہیں؟

ج: میں ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہوئی اور بیگم جی اے خان کی جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کیا۔

س: گرل گائیڈ کے مقاصد کے بارے میں بتائیں؟

ج: پاکستان گرل گائیڈ کا مقصد اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی راہنمائی کرنا اور انھیں سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کرنا تھا۔ پاکستانی لڑکیوں کو باوقار طریقے سے زندگی گزارنے کا سبق دینا تھا میں اپنی قوم کی بچیوں کو مضبوط کردار کی مالک، پر اعتماد، مہذب، با اخلاق، دوراندیش، مہربان، دوسروں کی مددگار، با ہمت، کفایت شعار اور امانت دار دیکھنا چاہتی تھی۔ یہی گرل گائیڈ کا ماٹو تھا۔ اسی لیے میں نے گرل گائیڈ کے ساتھ

کام کیا۔ آپ نے دیکھا ہوگا جن بچیوں نے سکول میں گرل گائیڈ کی تربیت حاصل کی ہوتی ہے انھیں ہم ہمیشہ دوسروں سے مختلف پاتے ہیں اور ان میں ان تمام خوبیوں کی جھلک ضرور نظر آتی ہے، جن کا میں نے تذکرہ کیا۔

س: ہماری بچیوں کو گرل گائیڈ کے ساتھ کام کرنے میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہوئی کیونکہ ہمارا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کیمپنگ کے لیے باہر جائیں؟

ج: گرل گائیڈ کافی معتبر نام ہے اور ہم لوگ پوری ذمہ داری نبھاتے تھے۔ اس لیے والدین بخوشی بچیوں کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دیتے تھے۔ بچیاں گروپ کی صورت میں رہتی تھیں اس لیے محفوظ رہتی تھیں۔ "Group is Strength" اکٹھے رہنے اور کام کرنے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔

س: گرل گائیڈ کا صدر دفتر کہاں ہے اور کب بنا؟

ج: ہماری بچیاں کیمپنگ کے لیے مری جاتیں۔ بوائے سکاؤٹ پہاڑی پر رہتے تھے۔ لڑکیوں کے لیے ہم گائیڈ ہاؤس چاہتے تھے۔ جوان لڑکیوں کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے ہم چاہتے تھے ان کے لیے محفوظ جگہیں ہوں جہاں لڑکیاں جا کر رہیں۔ ان دنوں اسلام آباد بن رہا تھا بیگم جی اے خان نے مجھے کہا کہ جا کر CDA والوں سے ملو وہ سیکٹر بنا رہے ہیں ہمیں بھی گائیڈ ہاؤس کے لیے پلاٹ الاٹ کریں۔ میں اسلام آباد گئی ڈاکٹر فرحت حسین سے ملی اور بات کی۔ انھوں نے کہا جگہ منتخب کرو۔ ہم نے جگہ پسند کر کے انھیں بتا دیا بعد میں انھوں نے خط لکھا کہ یہ جگہ ہم نے فاطمہ جناح پارک کے لیے چنی ہے آپ کوئی اور جگہ ڈھونڈیں پھر ہم نے ریلوے اسٹیشن کے پاس جگہ دیکھی۔ اب گائیڈ ہاؤس اسلام آباد میں اسٹیشن کے پاس ہے تاکہ بچیوں کو آنے جانے میں آسانی ہو۔ وہاں مختلف سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ جب کبھی بیرونی وفد آتے تو ان کی بیویوں کو ہم گائیڈ ہاؤس لے جاتے اور بچیوں کی کارکردگی دکھاتے۔ ان کی کارکردگی اس قابل ہوتی تھی کہ غیر ملکی مہمانوں کو دکھائی جا سکے۔

س: کیا آپ اس سلسلے میں بیرونِ ملک بھی گئیں؟

ج: جی ہاں! میں نے گرل گائیڈ کے سلسلے میں بہت سی کانفرنسیں اٹینڈ کیں پاکستان کی نمائندگی بھی کی اور تقریباً ۲۲ ممالک میں گئی۔

س: آپ نے تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا۔ کوئی یاد؟

ج: میری عمر اس وقت چھوٹی تھی۔ جذبہ بہت تھا۔ میں نے قائداعظم کا ۲۰ اکتوبر والا لاہور کا جلسہ لائیو سنا ہے جو یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں ہوا تھا۔ اس جلسے میں قائداعظم تقریر کر رہے تھے ان کی آواز رعب داب والی تھی۔ عورتوں کے لیے علیحدہ ٹینٹ لگا ہوا تھا جس میں عورتیں بیٹھ کر تقریر سن رہی تھیں۔ ہم لوگ قائداعظم کی جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ کوئی صورت نظر نہیں آ رہی

تھی۔ ہمارے قریب بیٹھی ایک خاتون کے پاس قینچی تھی اس نے قینچی سے ٹینٹ میں سوراخ کر دیا اب ہم سب نے باری باری اپنے محترم قائد محمد علی جناح کو دیکھا۔ اس طرح انھیں دیکھنے کی خواہش پوری ہوئی۔

پارٹیشن کے وقت ہونے والے اندوہناک واقعات کی وجہ سے قائداعظم بہت پریشان تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس قتل و غارت گری کی سخت مذمت کی۔ ان کے لاہور کے اس دورے میں بیگم جی اے خان ان سے ملنا چاہتی تھیں مگر انھوں نے پریشانی کے باعث ملاقات کا وقت نہ دیا۔

س: کیا آپ کی محترمہ فاطمہ جناح سے ملاقات رہی؟

ج: جی ہاں! بیگم جی اے خان کے محترمہ فاطمہ جناح سے اچھے تعلقات تھے۔ جب انھوں نے فاطمہ جناح صاحبہ سے گرل گائیڈ بنانے کے لیے اجازت مانگی تو فاطمہ جناح نے کہا:

"Build up the young and Fatima will be with you."

نوجوان نسل کی تعمیر کرو فاطمہ تمھارے ساتھ ہے۔''

ہماری ان سے یہ ملاقات ۲۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ہوئی۔ پھر وہ ہماری تنظیم کو دیکھنے آئیں۔ وہ گرل گائیڈ کو بہت Sponsor کرتی تھیں۔ بیگم جی اے خان ان کو چائے پر اور کھانے پر بھی بلاتی تھیں۔

س۔ آپ نے کن کن تنظیموں کے ساتھ کام کیا؟

جواب: سوشل سروس آرگنائزیشن ابوبکر بلاک گارڈن ٹاؤن میں ہے ان کے ساتھ کام کیا۔ دارالامان، انجمن حمایت اسلام، آپا نثار فاطمہ کی تنظیم پاک انجمن کی فاؤنڈنگ ممبر رہی، فی سبیل اللہ ٹرسٹ کی بھی فاؤنڈنگ ممبر ہوں۔ ویف (WAF) نامی تنظیم نے پردے کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا وائٹ ہاؤس جو زمان پارک کے قریب ہے اس میں ان کا اجلاس ہوا جس میں پردے کے خلاف تقریریں کی گئیں جس کا ہمیں بے حد قلق تھا۔ میں نے اور بیگم نعیمہ جہانگیر صاحبہ نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے ملک کی مؤثر خواتین کی ایسی تنظیم بناتے ہیں جو اسلام پسند ہوں۔ اس سلسلے میں ہم بیگم ابوالاعلیٰ مودودی صاحبہ سے ملے، بیگم نجم منور علی جو ماڈل ٹاؤن کلب کی صدر تھیں ان سے ملاقات کی، آپا نثار فاطمہ نے سب سے بڑھ کر ہمارا ساتھ دیا یوں ہم نے پاک انجمن خواتین کی بنیاد رکھی۔

محترمہ زہرہ وحید صاحبہ دین پر چلنے والی بے حد متحرک خاتون ہیں۔ آپ قول و فعل میں یکساں ہیں۔ وہ بے شمار سماجی اداروں کو چلانے والی خاتون ہیں۔ ادارے ہر کسی کے کام اور مدد سے چلتے ہیں۔ وقت نکالنا لوگوں کو ملنا ان میں یہ تمام خوبیاں ہیں ان کے ساتھ مل کر ہم نے فی سبیل اللہ ٹرسٹ بنایا۔ بیگم شیرازی نے معذوروں کی بحالی کے لئے کام کیا تو میں ان کے ہمراہ رہی۔ مجھے کام کرنے کے بہت سے مواقع ملے۔

میں چونکہ اپنی آپا کے ساتھ رہائش پذیر تھی اس لئے گھر کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا آپا کا کام تھا مجھے ہر طرف سے بے فکری تھی اس لئے میں نے بہت زیادہ کام کیا۔

س۔ بے لگام میڈیا کے اس دور میں بچوں کو ٹی وی اور انٹرنیٹ کے اثرات سے کیسے محفوظ رکھا جاسکتا ہے؟

ج۔ میڈیا بہت بڑا ہے اور ہم ایک نقطہ ہیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں لیکن اگر نوجوان نسل اور بچوں کی صحت مند سرگرمیاں جاری رہیں تو بہت حد تک بچا جاسکتا ہے۔

س۔ آپ لڑکیوں کے لئے رول ماڈل کسے سمجھتی ہیں؟

ج۔ میں محترمہ فاطمہ جناح اور بیگم جی اے خان کو رول ماڈل سمجھتی ہوں جنہوں نے اپنی زندگیاں قوم کی خدمت میں گزار دیں۔ بیگم جی اے خان پر گھریلو ذمہ داریاں تھیں پھر بھی انہوں نے پاکستان کی خدمت کی۔

س۔ پاکستان کے حالات کا ذمہ دار کون ہے؟

ج۔ ہم حالات کی خرابی کا ذمہ دار ماں باپ کو سمجھتے ہیں جنہوں نے نئی نسل کی درست تربیت نہیں کی۔

س۔ نوجوان نسل کے لئے کوئی پیغام۔

ج۔ کردار سازی پر توجہ دیں۔ اپنے فرائض کو نظر انداز نہ کریں۔ اپنے ملک پاکستان سے ایسے محبت کریں جیسے ماں باپ سے محبت کرتے ہیں۔ ماں باپ جیسے بھی ہوں بہر صورت ان سے محبت تو ہوتی ہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر کسی کو اہمیت دیں اسے پیار کریں اس سے مخاطب اپنے آپ میں اعتماد محسوس کرے گا کہ میں بھی زندگی میں کچھ کر سکتا ہوں۔

س۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ جو کچھ حاصل کرنا چاہتی تھیں آپ نے وہ سب کچھ پالیا؟

ج۔ میری زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ بے لوث اور مثبت کام کروں سو مجھے زندگی میں اس کے بھرپور مواقع ملے اور یہی میں چاہتی تھی۔

س۔ کوئی ایسا واقعہ جس پر آپ کو پچھتاوا ہو؟

ج۔ زندگی میں جو ہوا ہے سب اچھا ہوا ہے سب اللہ کا کرم ہے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔

س۔ زندگی میں کس کی محبت کو آپ نے سب سے زیادہ محسوس کیا یا یوں کہہ لیں کہ محبت کا رشتہ کون سا ہے؟

ج۔ والدین کے بعد بہن سے تھا۔ میں ان پر depend کرتی تھی وہ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتیں، ان سے دوستی کا تعلق تھا ہر طرح کی بات کر لیتی تھی، ان کے کام میں دخل نہیں دیتی تھی۔ بیگم نعیمہ جہانگیر سے بھی پیار و محبت کا رشتہ تھا ان کی وفات کے بعد سب کہتے تھے تم آپا کے بغیر اچھی نہیں لگتی میں ان کو بہت مِس کرتی ہوں۔

س۔ کیا آپ کو آپ کی خدمات پر حکومت کی طرف سے کوئی ایوارڈ ملا؟

ج۔جی ہاں مجھے حکومت کی طرف سے طویل خدمات کے اعتراف میں میڈل ملا تھا۔

س۔کن لوگوں پر آپ کو غصہ آتا ہے؟

ج۔جو کام نہ کرے اس پر غصہ آتا ہے۔

س۔آپ کا پسندیدہ لباس، کھانا اور رنگ کون سا ہے؟

ج۔زیادہ تر ساڑھی ہی پہنی، اب شلوار قمیض پہنتی ہوں۔کھانے میں کوئی خاص چیز پسند نہیں جو ملے کھا لیتی ہوں۔رنگ کے بارے میں کبھی سوچا نہیں۔ ہر طرح کے رنگ پسند ہیں۔

س۔آج کل کیا مصروفیات ہیں؟

ج۔گائیڈ ہاؤس میں جانا ہوتا ہے۔میٹنگز میں بھی شامل ہوتی ہوں۔عزیز رشتہ دار اور ایڈوائزر ملنے آتے رہتے ہیں۔

آپ کے وقت کا بہت شکریہ۔ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ ناسازی طبیعت کے باوجود آپ نے ہم سے طویل بات چیت کی اور اپنے خیالات سے نوازا۔

☆☆☆

رب سے ملاقات

کہتے ہیں ایک بچہ رب کی تلاش میں نکلا۔ اس کے پاس روٹی کا ٹکڑا تھا۔ راستے میں ایک جگہ اسے ایک بوڑھی عورت ملی جو اس آس میں سرراہ بیٹھی تھی کہ رب اسے ضرور روٹی کھلا دے گا۔ بچے کو بوڑھی عورت پر رحم آیا اور اس نے روٹی بوڑھی عورت کو کھلا دی۔ وہ اپنے حصہ کا رزق بوڑھی عورت کے حوالے کر کے اتنا مطمئن اور مسرور ہوا کہ اس کی روح جھوم اٹھی۔ طمانیت کے احساس سے اس نادان معصوم بچے کو لگا کہ شاید یہی رب ہے جس نے مجھے اتنی سچی خوشی دی۔ مگر اس نے سوچا ''یہ کچھ بوڑھا ہو گیا ہے''

ادھر بھوکی عورت کا پیٹ بھر گیا تو توانائی نے اس کا حال بدل دیا۔ اس ان جان عورت نے دل میں خیال کیا ''شاید یہی رب ہے مگر ابھی کچھ چھوٹا ہے۔''

طمانیت کا احساس حاصل ہونے اور بھوک کا غم دور ہونے پر دونوں معصوم دیوانوں کے احساسات ایک جیسے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی ایک دیوانے سے ملاقات ہوئی جو اپنے رب کی خدمت کرنے کو بے تاب تھا۔ اپنی دل کی محبت کا احساس اسے کیا کیا کچھ کہلوا رہا تھا۔ اور واہ! کیا شان ہے اس رب دو جہاں کی کہ محبت قبول کر لی، اس دیوانے کی جو رب کو نہلا دھلا کر کنگھی کر کے خوش ہونا چاہتا تھا۔ رب نے اس دیوانے کی محبت کے سامنے اپنے نبی کلیم اللہ کو سرزنش کر دی۔

مطلوب تو دل کی سچی محبت ہے۔ وہ جو سب محبتوں پہ حاوی ہو۔ ہر لمحہ ہو، ہر آن ہو، ہر نظر اور ہر سانس کے ساتھ ہو۔

رب سے ملاقات کا شوق ان کو ہی ہوتا ہے جن کو اس سے محبت ہوتی ہے۔ نیکی کر کے دل میں جو راحت محسوس ہوتی ہے وہی تو رب کا احساس ہے۔ دوسروں کی ضرورتیں پوری کر کے جو آسودگی من کے سمندر میں لہریں پیدا کرتی ہے وہی لطف وانبساط تو قبولیت کا سندیسہ ہے۔ یعنی امر یہی ہے کہ زائد از ضرورت مال اور اشیا ہماری نہیں اوروں کی ہیں۔ سالوں چیزیں سنبھالے رکھتے ہیں اس آس پر کہ کبھی تو ضرورت پڑ جائے گی۔ جس کو آج ضرورت ہے وہ انتظار میں ہے۔ اور دل میں رب سے ملاقات کا احساس حاصل ہونے کے مواقع انہی اشیا اور مال و دولت سے وابستہ ہیں۔ اپنے نفس کی طمانیت درکار ہے یا اپنے قلب وروح میں نیکی کی سرشاری، اور رب دو جہاں کے قرب کا احساس؟ نفس تو کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ رب دو جہاں

قدر دان ہے ذرے کو آفتاب بنا سکتا ہے۔

قدر دانی کا احساس ہر انسان کو اعتماد بخشتا ہے اور اگر یہ قدر دانی اللہ رب العزت کی طرف سے ہو تو کیا پر اعتماد شخصیت وجود میں آتی ہے۔ جس انسان کو رب کی معیت وقرب حاصل ہو جاتا ہے وہ ہر حال میں سرشار رہتا ہے، مطمئن ومسرور رہتا ہے کیونکہ کائنات کے ہر ذرے میں رب کائنات کی شان کو جلوہ گر دیکھتا ہے۔ آسمان کی وسعتوں میں اڑنے والے پرندوں کی ڈار ہو یا اردگرد کے سارے حسین مناظر، ہمیشہ اس خالق کائنات کی نظروں میں ہیں اور اس کے بندے کی نظروں میں بھی وہ بندہ آپ بھی ہیں وہ ذات ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔ گویا کہ ہم کسی منظر سے اکیلئے نہیں محظوظ ہو رہے ہیں۔ وہ جو اس منظر کا خالق ہے وہ بھی ساتھ ہی ہے۔ مصور خود اپنی تصویریں دکھا رہا ہے کسی واسطے، کسی ترجمان، کسی سیکرٹری کے بغیر۔

یہ سمندر، پہاڑ، دریا، پھول پھل باغات، چاند ستارے، غرض ہر دل خوش کن منظر میں ہم تنہا کہاں ہیں؟ وہ رب، خالقِ کون ومکان آپ کے قریب ہے میرے قریب ہے۔ اتنا قریب کہ آتی جاتی سانس اس طرح محسوس ہو رہی ہے کہ گویا ''فنفخت'' کا زندہ احساس ہے۔ اس کی پھونکی ہوئی روح ہی تو یہ آتی جاتی سانسوں کا امر ربی ہے۔ جب مومن ایمان کی اس کیفیت کو پہنچ جاتا ہے کہ ''اپنے رب کو دیکھ رہا ہے'' تو اس کو محسوس ہوتا ہے اھد نا الصراط المستقیم کا جواب مل رہا ہے۔ رب کائنات نے ہاتھ تھاما ہوا ہے۔ اسی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسی کے احساس میں سانس لیا جا رہا ہے۔ ایک باپ کا وجود ساتھ ہو تو بچہ بھرے میلے میں خود کو مامون ومحفوظ سمجھتا ہے اور میلے کی ہر شے پر کشش لگتی ہے۔ اگر بچہ تنہا ہو یا گم ہو چکا ہو تو پھر سارے منظر بدل جاتے ہیں۔

اسی طرح مومن کو اپنے رب کی انگلی پکڑ کر دنیا کے میلے میں گزرنا آسان لگتا ہے۔ ہر کام سے حظ بھی اٹھاتا ہے۔ ہر مشکل گھاٹی سے گزرتے ہوئے اپنے رب کی ہم راہی ''ان اللہ معنا'' کی شکل میں حوصلہ دلاتی ہے۔ اور جو اپنے رب کے ہم راہی ہونے، اس کے یقینی ساتھ کا اعتبار کھو دیتے ہیں وہ بھرے میلے میں اپنے ماں باپ سے بچھڑنے والے بچے کی طرح ہو جاتے ہیں۔ حیران، سرگرداں، مایوس، پراگندہ، اور ایسے ہی لوگ شیطان کے لئے کارآمد ہوتے ہیں۔

آیئے، اپنے جذبات واحساسات میں رب کی معیت کو زندہ کریں۔ اپنے ہر کام میں اس کی معاونت کو محسوس کریں۔ اپنے ہر قدم کے ساتھ اس رب کے ہاتھ کو یاد کریں جو اندھیروں میں راہ دکھانے والا ہے۔ وہ ساتھ ہے ہم جیسے بھی ہیں جہاں بھی ہیں۔ ہم جدھر منہ کریں ادھر اللہ کا رخ ہے۔ وہ ہی تو ہے جو بیماری کی سختیوں سے نکال کر صحت عطا فرماتا ہے۔ جب ہم ہنستے ہیں تو اس کو علم ہے، جب ہم دکھی ہوتے ہیں تو وہ اور بھی قریب ہے۔ آنسو پونچھتا ہے حوصلہ دیتا ہے۔ کھلاتا

پلاتا ہے، وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان نہیں ہوتا۔ شرط ہے کہ اس پر توکل کیا جائے۔ اس کے دور ہونے کا احساس نہ جاگے۔ اس کے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہونے میں شک نہ ہو۔ یہ شک ہی ہے جو انسان کے دل کو خالی کر دیتا ہے۔ پھر رب تو ساتھ ہوتا ہے مگر بصیرت جاتی رہتی ہے۔

رب کی تلاش کو نکلو تو معلوم ہوتا ہے وہ تو ادھر ہی ہے، جہاں کا کونسا ٹکڑا ہے جہاں وہ نہ ہو۔ زمین کا کونسا حصہ ہے جہاں وہ نہ پایا جاتا ہو۔ تلاش تو اس کو کیا جاتا ہے جس کی ''کرسی'' کسی خاص علاقے کے لئے ہو۔ انتظار اس کا کیا جاتا ہے جو قریب نہ ہو، سامنے نہ ہو۔ دور سے آنا ہو ہر نیا آنے والا بچہ اس کا سندیسہ لاتا ہے۔ جو بھول گئے ہیں انکو یاددہانی ہے ''تم بھی ایسے ہی تھے۔'' دنیا سے جانے والا پیغام دے جاتا ہے ''تم نے بھی ایسے ہی جانا ہے۔''

بس اس ''آنے'' اور ''جانے'' کے درمیان کا وقفہ اس ذات باری تعالیٰ سے تعلق نبھانے کا امتحان ہے۔ اس کے ساتھ ہونے کے یقین کو ''حقیقی یقین'' میں ڈھالنے کا عمل ہے۔ اس کے قرب کو کوئی مانے نہ مانے وہ تو بندوں کو دیکھتا ہے۔ ان کے ساتھ ہے۔ شہ رگ سے قریب ہے۔ وہ محبّ بھی ہے محبوب بھی۔ جب کوئی اللہ کو بھلا دیتا ہے تو اللہ بھی اس کو بھلا دیتا ہے۔

محبوب کی نظروں سے گر جانے سے بڑا کوئی عذاب نہیں ہوتا۔ کہ وہ ساتھ ہی ہو اور پروا بھی نہ کرے۔

اب انتخاب ہمارا اپنا ہے!!

☆☆☆

ہوئے ڈر کے ہم جو رسوا.....!

ڈر نہ صرف موروثی بیماری ہے بلکہ ایک عالمی بیماری ہے، جسے لاحق ہو جائے اسے مار کر ہی چھوڑتی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ''جو ڈر گیا وہ مر گیا'' چنانچہ بہت سے جی دار لوگ جیتے جی اس کے لاحق ہونے کا اعتراف نہیں کرتے (اعتراف اور اقرار کرنے میں بھی ڈر مانع ہوتا ہے) مگر کچھ اہل دل اس اعتراف سے نہیں گھبراتے اور برملا اعتراف کر لیتے ہیں کہ ؎

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

ڈر کے بارے میں ہماری جو بھی رائے ہے وہ ذاتی ہے۔ آپ اتفاق نہ کریں تو ماہرین نفسیات سے رجوع کر سکتے ہیں۔ ویسے یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ نبض ہماری ہوتی ہے اور نبض شناسی کا دعویٰ معالجین کرتے ہیں، نفس ہمارا ہوتا ہے اور رائے ماہرین نفسیات کی مقدم مانی اور سمجھی جاتی ہے۔ ڈر اور خوف کے وجود سے ہمیں بالکل اسی طرح انکار نہیں جیسے آپ کو پاکستان میں دہشت گرد عناصر کی موجودگی سے انکار نہیں ہے۔ ڈر کے بارے میں ہم آپ کو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ نہ یہ بے رنگ ہوتا ہے، نہ بے بو ہوتا ہے اور نہ ہی بے ذائقہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ڈر کے مارے زرد پڑتے چہرے تو آپ نے دیکھ ہی رکھے ہوں گے (اگر نہیں دیکھے تو دھماکہ کی خبر سن کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو جائیے) ڈرا گر بے بو ہوتا تو ڈرانے والا، ڈرنے والے کی بو سونگھتے ہوئے اس کا یوں پیچھا نہ کرتا جیسے آدم خور آدم بو پا کر آدمی پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ رہ گیا ذائقہ! تو ڈرنے والے کے لیے ہر چند کہ اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے مگر ڈرانے والے سے پوچھئے کہ کتنا لذیذ اور ذائقہ دار لگتا ہے۔

ڈر کے بارے میں ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ اس کا جائے قیام دماغ کے بالائی حصے میں ہوتا ہے یا زیریں حصے میں!! یا پھر یہ دلِ داغدار میں کہیں مقیم رہتا ہے۔ ہم تو بس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارتے رہ جاتے ہیں..... ہر دفعہ ہمیں اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے مگر ہر دفعہ..... وہ ہمارے ہاتھ سے بالکل اسی طرح نکل جاتا ہے جس طرح پولیس کے ہاتھ سے مجرم!!

ڈر ایک ایسی بلا ہے جو لگائے نہ لگے اور بھگائے نہ بھگے! ڈر کے بارے میں ٹیپو سلطان نے کہا تھا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے!'' اب آپ کو یہ اعتراض ہوگا کہ اس قول میں ڈر کہاں ہے! (بھئی ڈر کوئی نظر آنے والی چیز ہے؟ وہ تو چھپا رہتا ہے۔ کسی کا سات پردوں میں کسی کا ایک دو

پردوں میں) دراصل شیر جب ڈر جاتا ہے تو گیدڑ بن جاتا ہے اور گیدڑ بننے کے بعد گیدڑ بھبھکیاں دے دے کر زمانے سے خود کو شیر منوالیتا ہے۔

جس طرح ایک جھوٹ کے بعد آپ کو سینکڑوں جھوٹ بولنے پڑتے ہیں بالکل اسی طرح اگر آپ ایک دفعہ ڈر جاتے ہیں تو ایک ڈر کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ڈر آپ کو ڈرانے پر مامور ہو جاتا ہے۔ آپ ایک ڈر سے نکلتے ہیں، دوسرا ڈر آپ کو گھیر لیتا ہے (اور گھیرنے کے بعد نئی حلقہ بندیاں شروع ہو جاتی ہیں) آپ کے ڈرنے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح آپ کے دوست نما دشمنوں کو پہنچ جاتی ہے اور باری باری سب آپ کو ڈرانا شروع کر دیتے ہیں۔

ڈر محض ڈرانے والے کی وجہ سے پروان نہیں چڑھتا بلکہ (اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں) اس میں سارا ہاتھ ڈرانے والے کا ہوتا ہے ڈرنے والا تو بے چارا معصوم ہوتا ہے، کبھی احتراماً ڈر جاتا ہے، کبھی مروتاً ڈر جاتا ہے، کبھی ضرورتاً ڈر جاتا ہے، کبھی محبتاً اور کبھی طبیعتاً ڈر جاتا ہے۔ جیسے ایک شوہر نامدار نے بیگم سے کہا کہ..... ''یہ کیا !.....تم پھر ایک دوپٹہ لے آئیں .....ابھی پرسوں ہی تو.....'' بیگم نے چیختے ہوئے کہا۔'' کیا پرسوں؟ ..... بولو..... بولو'' شوہر غریب فرمانے لگے ''میں کہہ رہا تھا پرسوں تو تم ایک ہی دوپٹہ لائی تھیں، آج دو خرید لیتیں!''

ڈر کے لیے آپ کہہ سکتے ہیں کہ

؎ وقت کرتا ہے پرورش برسوں
آدمی ایک دم نہیں ڈرتا

ہمارے یہاں ڈرانے کی پریکٹس پالنے سے ہی شروع کر دی جاتی ہے۔ یعنی پیمپرز کے انتخاب سے پہلے ہی ''بھاؤ'' سے ڈرانا شروع کر دیا جاتا ہے اور اس تجربے کی کامیابی کے بعد یکے بعد دیگرے اسے مسلسل اور ساری عمر ڈرایا جاتا ہے (ڈرانے والے بدلتے رہتے ہیں) جو پیدائشی ڈرپوک ہوتے ہیں وہ ڈر ڈر کے ایسے ہو جاتے ہیں کہ نہ بندہ رہتے ہیں نہ بندہ نواز .....اور جو بہادر ہوتے ہیں وہ ڈرانے لگتے ہیں۔ کچھ عزت ماب لوگوں کو آپ نے بھی دیکھا ہو گا جن کا دعویٰ ہے کہ وہ خوفِ خدا کے باعث کسی سے نہیں ڈرتے ..... وہ زبان و بیان کے ساتھ ساتھ اپنی پوری باڈی لینگوئج کے ذریعے معصوم دلوں کو ڈرانے کا اختیار اپنے ہاتھوں میں یوں لے لیتے ہیں جیسے مارشل لاء کے بعد فوج ملک کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

ڈر چونکہ انسان کے اندر اور باہر ہمہ وقت موجود رہتا ہے اس لیے اس سے بچنے کے لیے انسان کوئی نہ کوئی تدبیر اور انتظام کرتا رہتا ہے۔ کبھی دیواریں اٹھاتا ہے، کبھی ہتھیار بناتا ہے، کبھی بلٹ پروف جیکٹس بناتا ہے، کبھی بلٹ پروف اسٹیج بنواتا ہے، کبھی بلٹ پروف گھر بنواتا ہے، کبھی دروازے پہ گارڈز تعینات کرتا ہے، کبھی گرما گرم بیانات جاری کرتا ہے، کبھی باہر نکل لیتا ہے اور کبھی بلاول ہاؤس میں چھپ جاتا ہے (؎ :

پوچھا جو اسلام آباد سے صاحب کدھر گیا..... بولا کہ ڈر کے ''بلاول ہاؤس'' میں چھپ گیا!) ہمارے لیے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ وہ تو بلاول کا ابا ہے بلاول ہاؤس میں چھپ جائے گا.....مسئلہ پھول کا ہے..... پھول کدھر جائے گا؟؟

☆☆☆